راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 16 واں سال

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

Monthly

Arxang

Lahore

مدیر اعلیٰ : عامر بن علی

مدیر : حسن عباسی

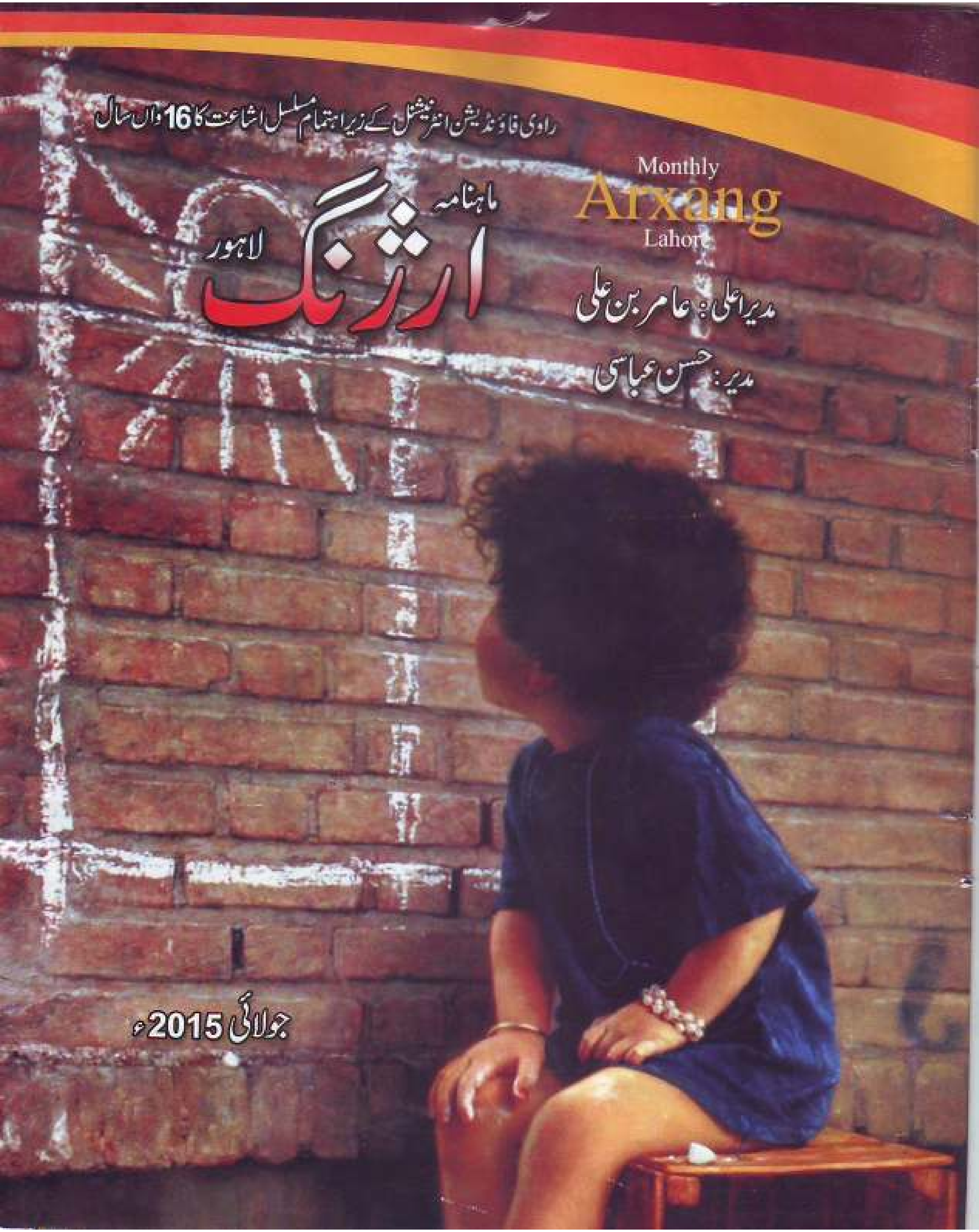

جولائی 2015ء

جاپان میں مقیم ممتاز شاعر و کالم نویس اور ماہنامہ ''ارژنگ'' کے مدیر اعلیٰ عامر بن علی کے اعزاز میں ڈاکٹر صغرا صدف کا ظہرانہ

ممتاز ادبی شخصیات

عطاء الحق قاسمی • امجد اسلام امجد
شعیب بن عزیز • نیلم احمد بشیر
عطاء الرحمٰن • ڈاکٹر سلمیٰ اعوان
سیما پیروز بخت • افضال فردوس
رُخسانہ نور • صوفیہ بیدار
سعد اللہ شاہ • حسن عباسی • نسیم اختر
راجا نیر اور نازبٹ کی شرکت

جاپان میں مقیم ممتاز شاعر، کالم نویس اور مدیر اعلیٰ ماہنامہ ''ارژنگ'' عامر بن علی گزشتہ دنوں پاکستان تشریف لائے تو ممتاز شاعرہ، کالم نویس اور ڈائریکٹر پلاک ڈاکٹر صغرا صدف نے GOR MESS میں اُن کے اعزاز میں ایک ظہرانے کا اہتمام کیا۔ جس میں نامور شاعروں اور ادیبوں عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، شعیب بن عزیز، عطاء الرحمٰن، نیلم احمد بشیر، ڈاکٹر سلمیٰ اعوان، افضال فردوس، رُخسانہ نور، سیما پیروز بخت، صوفیہ بیدار، سعد اللہ شاہ، حسن عباسی، نسیم اختر، راجا نیر اور نازبٹ نے شرکت کی۔ عامر بن علی کی شاعری اور شخصیت سے متعلق گفتگو بھی ہوئی اور ان سے شاعری بھی سنی گئی جسے بہت پسند کیا گیا۔ اظہار خیال میں عامر بن علی کی ادبی خدمات کو مقررین نے سراہا اور ان کے کالموں کے مجموعے آج کا جاپان کو حال ہی میں شائع ہونے والی کتب میں اہم کتاب قرار دیا گیا۔ اُن کے تراجم اور شاعری کے حوالے سے گفتگو ہوئی۔ آخر میں پرلطف لنچ کے بعد ڈاکٹر صغرا صدف نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیراہتمام مسلسل اشاعت کا 16واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

جلد نمبر ۱۷
شمارہ نمبر ۷
جولائی ۲۰۱۵ء

مدیر اعلیٰ ⊙ عامر بن علی

مدیر ⊙ حسن عباسی

مدیران اعزازی ⊙ ڈاکٹر صغرا صدف ⊙ ابرار ندیم ⊙ جعفر حسن مبارک

نائب مدیران ⊙ قمر ریاض ⊙ شازیہ نورین

مدیران معاون ⊙ نازاوکاڑوی ⊙ بدر سیماب

مدیر منتظم ⊙ علی رضا

مجلس مشاورت ⊙ محمود ظفر اقبال ہاشمی (سعودی عرب) ⊙ سعدیہ سیٹھی (دبئی)

قانونی مشیر ⊙ افتخار شوکت چودھری 0321-6012211

ارژنگ دوست ⊙ ایلا ظفر (امریکہ) ⊙ ارشد شاہین (کینیڈا) ⊙ اسعد رضوی (فرانس) ⊙ ارشد نذیر ساحل (چین)

کمپوزنگ ⊙ زریاب کمپوزنگ : 0321-4730769 ڈیزائنر ⊙ نعمان حسن : 0333-4918383

ٹائٹل ایڈگرافکس ⊙ محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 ناز اوکاڑوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبرشپ

بذریعہ ڈاک فی شمارہ (پاکستان) 1000 روپے • ڈاک خرچ بیرون ملک 5000 روپے

رابطہ : 0300-4489310 - 0331-4489310

فہرست

حمد / حسن عباسی ' ۲

نعت / ڈاکٹر خورشید احمد رضوی ' ۴

نعت / زاہد محمود شمس ' ۵

مضامین: ○ محمد اظہار الحق کی شاعری / منشا یاد ' ۶

○ توکلی مست / عاشق رنجیل ' ۸

○ میرا جی / ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ' ۱۲

○ امراؤ جان ادا معاشرتی تہذیب کا زوال اور لکھنوی دور / عائشہ مشعل ۱۴

○ امرتا پریتم اور امروز کا عشق / دستگیر شہزاد ' ۱۵

○ جام رکھا ہے ابھی...... عفرا قریشی / تکلیل امجد صادق ' ۱۶

طنز و مزاح: ○ تحقیق یا تفتیش / عطاء الحق قاسمی ' ۱۸

○ بیوی کیا ہے؟ / احمد سعید ' ۱۹

افسانے: ○ رونے کے لیے چاہیے کاندھا میرے دوست / محمود ظفر اقبال ہاشمی ' ۲۰

○ احساس کے سکے ' پشتون احمد زئی ' ۲۲

○ بات تو کچھ بھی نہیں تھی.....! / فوزیہ بھٹی ' ۲۴

○ وطن سے دور / نسیم سکینہ صدف ' ۲۷

○ گرم کوٹ / روبنسن سیموئیل گل ' ۲۸

○ لمس / بینش ولیم جانسن ' ۳۲

○ قلاش / محمود ایاز ' ۳۵

○ ارواح / محمد ابصار ' ۳۷

○ دل بگل / صدف زبیری ' ۳۹

شعری گوشے: محمد اظہار الحق، بشیر رزمی، رفعت ناہید، عنبرین اشعر ناز اوکاڑوی، ارشد سعید، افتخار شوکت، وحید قندیل ۴۱ تا ۴۸

عالمی اُردو شاعری ' ۴۹ تا ۵۰

شاعری ' ۵۱ تا ۵۹ مزاحیہ شاعری ' ۵۸

○ مختصر ادبی خبریں / تقریبات ' ۵۹

تبصرہ کتب ' ۶۰ تا ۶۹

○ نامہ ہائے احباب ' ۷۰

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد (زیرِ طبع شعری مجموعے "سائیں" سے پہلی حمد)

حسن عباسی

اپنی منت گزاریاں سائیں
تیری سب ڈیرہ داریاں سائیں

تیری جلوہ نمائیاں توبہ
صورتیں اتنی پیاریاں سائیں

آئینہ خانۂ حیات میں ہیں
تیری سولہ سنگھاریاں سائیں

میرے کجلا گئی ہیں شام و سحر
تیرے کجلے کی دھاریاں سائیں

تیرے ناموں میں دیکھی ہیں کیا کیا
اسم کی لالہ زاریاں سائیں

لمحے لمحے میں تھا گزر تیرا
ہم نے عمریں سنواریاں سائیں

دیکھ کر وسعتیں سخاوت کی
اپنی مانگیں نپھاریاں سائیں

تیرے کوچے، تری ہی گلیاں ہیں
ہاتھ اپنے "بُہاریاں"☆ سائیں

راج تیرا ہے، پاٹ تیرا ہے
تیری جنتا، کُماریاں سائیں

ہم نے سیر و سفر کیے تو کھلا
ہر سُو تیری سفاریاں سائیں

نقش تیرے ہیں کیا سے کیا ہر سُو
اور کیا کیا نگاریاں سائیں

جی حضوری کا چولا تن پہ ہے
سر کو ہیں تابع داریاں سائیں

ہیں پرندوں کے لہجوں میں تیری
کیسی کیسی بُلاریاں سائیں

تیرے بندوں میں ہی تجھے دیکھا
اور آنکھیں ہیں ٹھاریاں سائیں

ہم نے شکلیں بگاڑیاں کیا کیا
تو نے کیا کیا نکھاریاں سائیں

تیرے آگے کسی مداری کی
نہیں چلتی مداریاں سائیں

تیرے آگے رہیں دھری کی دھری
تیزیاں اور طراریاں سائیں

تیرے ہاتھوں پہ میں نے بوسے دیے
بن گئیں مینا کاریاں سائیں

ہر طرف تیرے جھولے چلتے ہوئے
اور اپنی اُڈاریاں سائیں

بچ کے جائیں تو ہم کہاں جائیں
تیری آنکھیں کٹاریاں سائیں

لڑکیوں میں کہیں کہیں تُو نے
اپنی حوریں اُتاریاں سائیں

زندگی نار کیوں ہے ان کے لیے
یہ جو تیری ہیں ناریاں سائیاں

روتی آنکھوں پہ اپنا دستِ کرم
ہیں محبت کی ماریاں سائیں

تجھ سے قربت کا اک بہانہ ہیں
اپنی پیڑوں سے یاریاں سائیں

کہاں جاتا ہے سینچ کر دل میں
راستے اور کیاریاں سائیں

کائناتیں دکھا دے پوشیدہ
کھول اپنی پٹاریاں سائیں

ہم نے تیری تلاش میں کی ہیں
حج و عمرے زواریاں سائیں

کھل کے اک بار سامنے تو آ
ختم کر پردہ داریاں سائیں

اپنے رازوں کی کھول دے ہم پر
جتنی ہیں "بُوہے باریاں" سائیں

روز گھڑتی ہیں زیورات ترے
ہم ہیں تیری سُناریاں سائیں

نشہ آور ہے تیرا عشق بہت
اور غضب کی خماریاں سائیں

تیرے میلے میں ہو گئی ہیں گم
ساری چیزیں ہماریاں سائیں

تیری سرکس کے سوہنے فنکار
ایک اک پہ میں واری آں سائیں

کیسے کیسے لگے ہیں میجک شو
جادوگریاں، نیاریاں سائیں

موت کے ہے کنویں پہ وہ رونق
نہیں جس کی شماریاں سائیں

کیا ہے پتلی تماشے کے پیچھے
ہم کو ہیں جان کاریاں سائیں

جب تو شہ رگ کے پاس رہتا ہے
کیوں چلاتا ہے آریاں سائیں

ماڑے بندوں پہ یونہی چلتی رہیں
تیری پروردگاریاں سائیں

تیرے در کے لگاتی ہیں چکر
ہم مصیبت کی ماریاں سائیں

کیا ہے اوقات کیا گزر اوقات
ساری چیزیں اُدھاریاں سائیں

ہوتی جاتی ہیں بوڑھیاں دل میں
خواہشیں سب کنواریاں سائیں

کیسے آنکھوں کی بارپالی ہو
ساری ندیاں ہیں کھاریاں سائیں

عام لوگوں سے کیوں نہیں ہوتیں
تیریاں چتر کاریاں سائیں

☆ جھاڑو

حمد (زیرِ طبع شعری مجموعے "سائیں" سے پہلی حمد)

حسن عباسی

اپنے پیاروں کو پھر بھی دیکھیں گی
کبھی آنکھیں ہماریاں سائیں

تیرے کھاتوں میں درج ہیں کہ نہیں
اپنی اختر شماریاں سائیں

فائلوں میں دبی ہوئی ہیں کیا
عرضیاں اپنی ساریاں سائیں

لمبی لمبی قطاروں میں اپنی
کیسے آئیں گی باریاں سائیں

مانگنے والے بچوں کو اپنی
بخش دے ریزگاریاں سائیں

جتنے گمنام ہیں شہید اُن کی
تختیں کچھ یادگاریاں سائیں!

ختم کر دے دلوں کے نقشے سے
جتنی ہیں حد براریاں سائیں

اپنا نائب بنا کے بخشی ہیں
کتنی بے اختیاریاں سائیں

تیرے ہاتھوں میں ہے مہار اپنی
کیسی پھر بے مہاریاں سائیں

روزِ اوّل سے اپنے کندھے ہیں
اور تیری سواریاں سائیں

دین و دُنیا کی ہم سے اُٹھتی نہیں
گٹھڑیاں اتنی بھاریاں سائیں

جس طرح چاہے کاٹ کر رکھ دے
ہم تو فصلیں ہیں تھاریاں سائیں

خیر ہو تیرے کارخانوں کی
اپنی تو چلتے واریاں سائیں

تیرا لینٹر ازل سے پڑتا ہوا
اپنے سر اور تغاریاں سائیں

اور ہم سے ادا نہیں ہوتیں
زیست کی راہداریاں سائیں

نہ کسک تو رہے گی تا بہ ابد
تیرے ہوتے میں ہاری آں سائیں

چھوٹے اڈوں پہ اپنی روکا کر
تیز رفتار لاریاں سائیں

زخم ویسے کے ویسے تھے اپنے
جب بھی پٹیاں اُتاریاں سائیں

تو نے راتاں بنائیاں ہیں فقط
اور ہم نے گزاریاں سائیں

تیرے کپڑوں پہ اب نہیں لگتیں
ہم سے گوٹا کناریاں سائیں

ہے "الف" سے انارکی دل میں
"ب" سے ہیں بے قراریاں سائیں

زنگ آلود زیست کی گاڑی
گھس گئی ہیں گراریاں سائیں

زندگی کو زباں لگائیں کیا
چٹاں ہیں کٹاریاں سائیں

یہاں سب کا ہے کوئی بچھڑا ہوا
کیسی میگھا، ملہاریاں سائیں

پھول مٹی کے پاس امانت ہیں
کیسی بے اعتباریاں سائیں

اب تو رونے سے بھی نہیں چھٹتیں
دل کی گرد و غباریاں سائیں

اب ان آنکھوں سے رویا جاتا نہیں
تھک گئی ہیں وچاریاں سائیں

ہاتھ سب کا ہتھیلی پہ پڑتا ہے
دل پہ ضربیں ہیں کاریاں سائیں

تیری دُنیا میں یونہی ہوتی رہیں
دل کی چوری چکاریاں سائیں

کتنی شکلیں ڈبوئیاں تو نے
جانے کتنی اُبھاریاں سائیں

شانت رکھ زلزلے کہ ہم نے کیں
بڑی مشکل "اُساریاں"☆ سائیں

ختم ہونے میں کیوں نہیں آتیں
تیری "کھٹی کھناریاں" سائیں

کیا وہ سمجھیں ترا نظامِ حیات
جو نہ سمجھیں اشاریاں سائیں

تو نے دُنیا بنا کے بھر دی ہیں
ہم میں کیا تابکاریاں سائیں

اور کتنے ہیں راستے پُرخار
اور کب تک ہیں خواریاں سائیں

سر پٹختے ہیں تیری چوکھٹ پہ
کیا تہجد گزاریاں سائیں

کیا اُٹھائیں گر جنہوں نے کیں
صرف خدمت گزاریاں سائیں

مانگتے ہیں دُعائیں جتنی ہم
کرتے ہیں دُکھ "دوھاریاں" سائیں

سر دیا ہے تو اِس کو چھت بھی دے
ختم کر بے دیاریاں سائیں

پاؤں بھی ساتھ ہی گئے اپنے
جوتیاں جب اُتاریاں سائیں

تیرے فرمانوں کی کبھی چھٹیاں
ہم پہ ہوتی ہیں جاریاں سائیں

حصہ تو اس طرح سے دیتا ہے
جیسے ہوں ساجھے داریاں سائیں

منہ چھپائے یونہی نہیں پھرتے
ہیں بڑی شرمساریاں سائیں

جیسے شادی پہ جانا ہو ہم نے
کی ہیں ایسے تیاریاں سائیں

راہ چلتے تو ہو نہیں سکتیں
باتیں ہیں ڈھیر ساریاں سائیں

☆ تعمیرات

نعت

ڈاکٹر خورشید رضوی

ہر لفظ کا ایک سایہ ہوتا ہے جس کو معنی کہتے ہیں۔ اچھا شاعر لفظ کو محسوس کر کے اس طرح استعمال کرتا ہے کہ اس کے حقیقی معانی سننے اور پڑھنے والوں پر آئینہ ہو جاتے ہیں۔ کاریگری اور ہنروری میں بڑا فرق ہے۔ کاریگری جب تخلیقی وفور کی آنچ سہتی ہے تو ہنرمندی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ خورشید رضوی کی نظم ہو، غزل ہو یا نعت و منقبت، اسی ہنروری کی روشن مثالیں ہیں۔ خورشید رضوی کا شعر دل اور دماغ کو بیک وقت متاثر کرتا ہے۔ خورشید رضوی کا تازہ شعری مجموعہ ''نسبتیں'' جو حمد و نعت اور سلام و مناقب پر مشتمل ہے اور جسے ارسلان احمد ارسل نے مرتب کیا ہے، اپنی عقیدت، شیفتگی اور نیاز مندی سے قطع نظر فنی نقطہ نگاہ سے تمام کا تمام ارفع شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ مشروب چاہے مٹی کے پیالے میں ہو یا چاندی کے کٹورے میں، اصل چیز تو وہی ہے لیکن ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم اپنی محبوب ہستی کو جو کچھ پیش کریں، وہ ظاہری طور پر بھی آنکھوں کو بھلا لگے۔ ''نسبتیں'' کا مطالعہ اس خیال کو یقین میں بدل دیتا ہے۔ (ڈاکٹر توصیف تبسم)

پادشاہا! ترے دروازے پہ آیا ہے فقیر
چند آنسو ہیں کہ سوغات میں لایا ہے فقیر
دیکھی دیکھی ہوئی لگتی ہے مدینے کی فضا
اس سے پہلے بھی یہاں خواب میں آیا ہے فقیر
اہلِ منصب کو نہیں بار یہاں پر لیکن
میرے سلطان کو بھایا ہے تو بھایا ہے فقیر
اب کوئی تازہ جہاں خود اسے ارزانی کر
کہ جہانِ دگراں سے نکل آیا ہے فقیر
اُس کو اک خواب کی خیرات عطا ہو جائے
کہ جسے دید کی خواہش نے بنایا ہے فقیر
اک نگہ جب سے عنایت کی ہوئی ہے اس پر
اک زمانے کی نگاہوں میں سمایا ہے فقیر

آغاز نہ انجام، ازل میں نہ ابد میں
کیا حسن مکمل ہے کہ آتا نہیں حد میں
ہو دل میں اگر اسمِ محمدؐ کا اُجالا
کافی ہے ہر اک دور کے ظلمات کے رد میں
وہ نور کا حلقہ ہے کہ باہر ہیں نکیرین
ہے زمزمۂ نعت بپا میری لحد میں
اے سیدِّ سادات یہ دل بجھ ہی نہ جائیں
آئے ہوئے ہیں صرصرِ حالات کی زد میں
بھیج اُنؐ پہ درود اور سلام اتنے خدایا
ہو جن کی سمائی کسی حد میں نہ عدد میں

ابر سا بن کے کڑی دھوپ میں چھا جاتا ہے
کس محبت سے مدینہ مجھے یاد آتا ہے
کوئی پھر عہد گزشتہ مجھے دِکھلاتا ہے
پھر اُسی بارگہ پاک میں لے جاتا ہے
شوق پھر چومتا ہے رحمتِ عالم کے قدم
اور پھر نشۂ اعزاز میں لہراتا ہے
پیکرِ خاک مسافر ہے سو جانا ہے اُسے
پر دلِ زار مدینے سے کہاں جاتا ہے

نازاں ہے اس پہ دل کہ بلایا گیا مجھے
آخر درِ حضورؐ پہ لایا گیا مجھے
اس راہ میں زمیں کی طنابیں کھچی رہیں
ہر گام گردشوں سے بچایا گیا مجھے
نادیدہ ایک لمسِ محبت تھا دستگیر
تھک کر اگر گرا تو اُٹھایا گیا مجھے
سورج بھی اقتدا میں چلا اور کشاں کشاں
لے کر حضور میں، میرا سایہ گیا مجھے
ہر کہکشاں کی گرد مرے بال و پر میں تھی
ایسی بلندیوں پہ اُڑایا گیا مجھے
اشکوں کی چلمنوں سے زمانے گزر گئے
جو کچھ سنا ہوا تھا، دکھایا گیا مجھے
خورشیدؔ حاضری یہ نصیبوں کی بات ہے
نازاں ہے اس پہ دل کہ بلایا گیا مجھے

سمجھو کہ سب دُکھوں سے شِفا ہو گئی مجھے
جب دل دُکھا ہے نعت عطا ہو گئی مجھے
مجھ کو کسی سے پوچھ کے جانا نہیں پڑا
وہ رہگذر ہی راہ نما ہو گئی مجھے
میں ایک مشتِ خاک تھا اور وہ بھی منتشر
شیرازہ اُس گلی کی ہوا ہو گئی مجھے
ڈوبی جو واں جبیں عرقِ انفعال میں
موجِ سموم بادِ صبا ہو گئی مجھے
حاصل تمام عمر کی بینائیوں کا تھی
دُزدیدہ اک نظر کہ روا ہو گئی مجھ
سیرت کے آئنے پہ نگہ جم کے رہ گئی
یاد اُنؐ کی ایک ایک ادا ہو گئی مجھے

نعت

زاہد محمود شمس

جب زمانے سے چلنے لگتا ہے
دل مدینے کو چلنے لگتا ہے
دیکھ کر قافلہ مدینے کا
دل بدن سے نکلنے لگتا ہے
بے سکوں دل درود پڑھتے ہی
دھیرے دھیرے سنبھلنے لگتا ہے
دل میں اُبھرے جب انؐ کے پیار کا چاند
غم کا سورج تو ڈھلنے لگتا ہے
ذکر اُنؐ کا کریں تو دل میں عجب
چشمۂ نور اُبلنے لگتا ہے
جب مچلتی ہے انؐ کے در پہ ہوا
میرا دل بھی مچلنے لگتا ہے
دیکھ کر جذبۂ غلام نبیؐ
غیر پھر ہاتھ ملنے لگتا ہے
انؐ کی سیرت کی روشنی میں شمس
دل میں انسان پلنے لگتا ہے

کبھی تو مسلموں نے اُن کی سیرت پڑھ کے مانا ہے
جو پڑھ لیتا ہے سیرت اُن کی دل اُس کا بدل جائے
جو عشقِ مصطفیٰؐ میں ڈوب کر پڑھتا ہے نعتیں شمس
سکوں پا جائے دل اُس کا مصیبت اُس کی ٹل جائے

مدینے کی جانب قدم جب اُٹھے گا
یقیناً یہ دل مجھ سے آگے چلے گا
مری نعت مہکے گی محفل میں جب بھی
مرا دل بھی محفل میں دُولہا بنے گا
مرا دل ہے کہتا، کبھی نہ کبھی تو
زمانہ مجھے اُنؐ کا شیدا کہے گا
میں مرنے کی دُھن میں مرا جا رہا ہوں
مجھے قبر میں عشق میرا ملے گا
سنبھالیں گے آخر مجھے میرے آقا
زمانہ مجھے تنگ کتنا کرے گا
یہ نعتیں ہیں جس کی وہ سنتا بھی ہے شمس
سناتے رہیں ہم وہ سنتا رہے گا

پڑا رہوں گا میں انؐ کے در پر، کوئی جو پوچھے گا کون ہو تم
گدا ہوں آقا کا مسکرا کے کہوں گا میں بھی مدینے لوگو
وہاں سنا ہے فرشتے آ کر درود پڑھتے ہیں رات دن شمس
نظر جھکا کے درود دل سے پڑھوں گا میں بھی مدینے لوگو

یوں تو ہیں عرش و فرش پہ بھرپور دائرے
مانگے ہے دل مدینے کے پُرنور دائرے
جانا پڑے ہے جتنے بھی ہوں دور دائرے
کرتے ہیں میرے دل کو یہ مجبور دائرے
ہوتے اگر نہ آپ تو بنتی نہ کائنات
بنتے نہ کائنات میں غیور دائرے
انؐ کی ہر ایک بات ہے امن و سلامتی
روشن کریں یہ آپؐ کا منشور دائرے
ادنیٰ غلام ہوں میری اتنی ہے التجا
یارب کبھی بھی ہوں نہ یہ رنجور دائرے
رحمت سے بھر کے جھولیاں جاتے ہیں سارے لوگ
اتنے ہیں رحمتوں سے یہ معمور دائرے
بخشی ہے زندگی میں سعادت انہیں بھی یہ
یہ تو ہیں ذوالجلال کے مشکور دائرے
کرتے ہیں رشک جن و ملائک بھی مرحبا
یہ تو ہیں کائنات کے مشہور دائرے
ہر پھول ہر کلی کی زباں پر درود ہے
کیسے نہ ہوں گے شمس یہ منظور دائرے

مدینے کی فضاؤں میں مہک بن کر مچل جائے
مرے لب پر درودِ پاک ہو اور جاں نکل جائے
بلا لیں اب تو مجھ کو بھی مدینے پاک اے آقاؐ
ہے دھڑکن مضطرب برسوں سے اب تو یہ سنبھل جائے
مجھے اب ہے نہ دنیا کا نہ جنت کا کوئی لالچ
مرا اُن کی غلامی سے ہی اب تو کام چل جائے
دعا مانگوں میں روز و شب ملے مجھ کو بھی رُتبہ یہ
ثنائے مصطفیٰؐ میں میری ہر تحریر ڈھل جائے

بلاوا آئے گا مجھ کو اک دن چلوں گا میں بھی مدینے لوگو
اے جانے والو تمہاری طرح رہوں گا میں بھی مدینے لوگو
سنہری جالی سے میں لپٹ کر کروں گا دل کی تو ساری باتیں
کبھی نہ آنے کے سو بہانے کروں گا میں بھی مدینے لوگو
نظر کے رستے بھروں گا دل میں نظارے سارے وہاں کے پیارے
خزانے پلکوں سے روز چنتا پھروں گا میں بھی مدینے لوگو
میں باتوں باتوں میں پوچھ لوں گا وہاں کی مٹی سے اُن کی باتیں
وہ ساری اُن کی سنہری باتیں لکھوں گا میں بھی مدینے لوگو

محمد اظہار الحق کی شاعری

منشا یاد

ہمارے ہاں ایسے شاعروں کی کمی نہیں جن کو آپ اچھے یا ٹھیک شاعر کہہ سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے ایسے شاعر جن کا کلام عروض یا وزن کے لحاظ سے درست ہوتا ہے۔ مگر جن کے ہاں خیال یا فن کی سطح پر کوئی نئی یا چونکا دینے والی بات نہیں ہوتی اور حالانکہ ہر شاعر اور ادیب انفرادیت کی تلاش میں رہتا ہے۔ مگر نیا تجربہ کرنے یا نئی راہوں پر چلنے کی توفیق اور جرأت کم ہی لوگوں کو ودیعت ہوئی ہوتی ہے۔ غزل برائے خود نہایت روایتی صنف سخن ہے اور ایک عرصہ دراز سے ہزار ہا شاعر اس میں طبع آزمائیاں اور خامہ فرسائیاں کرتے آئے ہیں۔ اگر پامال مضامین سے انحراف نہ کیا جائے یا لفظ کے استعمال اور اسلوب کی سطح پر کوئی اضافہ یا تجربہ نہ کیا جائے تو بھیڑ میں گم ہو جانے سے بچنا محال ہو جاتا ہے۔ مگر جدت پسند اور انفرادیت کے متلاشی فنکار انہیں پرانے اوزاروں اور عام مٹی سے بھی نئی وضع کے کوزے بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

محمد اظہار الحق کی جدت پسند طبع نے اپنے لیے سب سے الگ منطقہ تلاش کر لیا۔ انہوں نے نہ صرف مٹی اور زمین ایسی چنی جہاں کسی دوسرے کا گزر نہ ہوا تھا بلکہ علامتوں استعاروں اور تلمیحات کی صورت اوزار بھی نئے استعمال کیے۔ بلکہ ایک دو جگہ پر تو انھوں نے غزل کا روایتی پیٹرن بھی بدل ڈالا۔ مثلاً وہ ایک غزل جس میں ہر شعر کا دوسرا مصرعہ تبدیل نہیں ہوتا اور ایک جیسا رہتا ہے۔ مگر اس غزل کا حوالہ میں آگے جا کر دوں گا کہ اس کے بارے میں کہنے کی کچھ اور باتیں بھی ہیں۔ انہوں نے اظہار کے لیے کہیں ضرورت کبھی تو نثری نظم کی صنف کو استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ ان کے اب تک چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا آدم جی ایوارڈ یافتہ ''دیوار آب''، ''دوسرا ''غدر'' تیسرا ''پری زاد'' اور اب چوتھا ''پانی پر بچھا ہوا تخت'' جو ابھی ابھی شائع ہوا ہے۔

وہ شاعری کے علاوہ ''تلخ نوائی'' کے نام سے اخبار میں کالم بھی لکھتے ہیں۔ ان کے کالموں کا مجموعہ زیر طبع ہے۔ اپنی بات کو کہانی کے انداز میں موثر طریقے سے کہنا، عام آدمی کے دکھ سکھ کو موضوع بنانا اور زندگی اور معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو بیان کرنا ان کے کالموں کی اہم خوبیاں ہیں لیکن ان کا اصل کام، مقام اور ذریعہ عزت و افتخار شعر گوئی ہے۔ جس کا ذوق انہیں ورثے میں ملا ہے اور ایک شاعر کے طور پر ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی علیحدہ پہچانے جانے والی لفظیات اور اُمتِ مسلمہ کے عظمت رفتہ کے آئینے میں موجودہ عہد کے معاملات کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش ہے۔ مسلمانوں کے شاندار ماضی کا تذکرہ کرتے ہوئے بظاہر وہ ماضی پرستی یا ناسٹلجیا کا شکار نظر آتے ہیں۔ مگر ایسا ہرگز نہیں ہے وہ نہ تو حال سے کٹے ہوئے ہی ہیں اور نہ ہی کہیں ان کا رویہ پدرم سلطان بود کا ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اسلامی عظمت پر افتخار اور اس کے احیاء کی خواہش ان کی شاعری میں ضرور نظر آتی ہے اور انہوں نے اسی عظیم تہذیب سے اپنی علامتیں، استعارے، تلمیحات اور لفظیات کا انتخاب بھی کیا ہے۔

ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے بار بار ان کے فنی سلیقے کی داد دینا پڑتی ہے۔ ان کی علامتیں اور تلمیحات ہر جگہ نگینوں کی طرح چمکتی اور اپنے ماضی میں گم ہو چکے اردگرد کو روشن کرتی معلوم ہوتی ہیں۔ محض ان کی لفظیات کا ذکر ہی ان کے موضوع اور مزاج کا تعین کر دیتا ہے جیسے پیادے، غلام سپاہ، لشکری، کنیزیں، کوزے، زیتون پوستین، عمامے، چوغے، زین، خورجین، گھوڑے، اسپ اور شہروں کے نام بلخ، بخارا، سمرقند، غرناطہ، الحمرا، بصرہ، سمرقند بلخ وغیرہ۔

بے شک ان کی شاعری میں جہاں جہاں امت مسلمہ کے زوال کے حوالے آئے ہیں نوحے کا سا تاثر نمایاں ہوا۔ مگر مایوسی ہرگز نہیں، انہیں ملال ہے کہ ملت نے درویشی اور فقیری چھوڑ کر زرپوشی اور بادشاہت اختیار کی اور زوال پذیر ہوئی اور ہزیمت کے تمغے سینوں پر سجائے۔

کیا رات تھی بدلے گئے جب نام ہمارے
پھر صبح کو خیمے تھے نہ خدام ہمارے
اے ارض سیہ روز کوئی اور ہی سورج
شاید کہ بدل جائیں یہ ایام ہمارے

....

چٹائی اور پیوند اور یہ زرپوش اُمت
حرا اور ثور کے غاروں میں جا کر رو پڑوں گا

وہ بہت سی غزلوں میں واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ مگر ان کے لہجے میں جو دکھ ہے اس کی نوعیت انفرادی اور ذاتی کہیں نہیں بلکہ ہر جگہ اجتماعی اور تہذیبی حوالے ہیں۔ مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سے پہلے اور بڑا سبب ان کی جمہوریت کشی اور جاہ پرستی ہے اور محمد اظہار الحق اُمہ کو لگے ہر روگ سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے اور دیکھئے کہ ان اشعار کو پڑھ سن کر کیا کچھ یاد آتا اور کہاں کہاں دھیان جاتا ہے۔ ان اشعار میں

الفاظ کی روانی اور فصاحت و بلاغت کی خوبیاں بھی ملحوظ خاطر ہیں۔

در و دیوار بھی کھا جائیں گے گھر کے محافظ
ترے گھر میں فقط نام خدا باقی رہے گا

....

غلام بھاگتے پھرتے ہیں مشعلیں لے کر
محل پہ ٹوٹنے والا ہے آسماں جیسے

....

مرے لپسپا سپاہی منہ چھپائے پھر رہے ہیں
مرے سردار ہارے بصرہ و بغداد دیکھو

....

گھوڑے حشم حویلیاں شملے زمین زر
میں دم بخود کھڑا رہا کتبوں کے سامنے

کالموں کی طرح ان کی نظموں میں اور بعض اوقات غزلوں میں بھی ان کا لہجہ تلخ ہو جاتا ہے لیکن جب ہم آج کے دور میں اُمت مسلمہ کی حیثیت، کردار اور حالت زار کو دیکھتے اور اسلامی مراکز کی کارکردگی کو ذہن میں لاتے ہیں تو ان کی تلخ نوائی کا جواز مل جاتا اور اس کی معنویت ہم پر پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

نئے فساد پہ ہم ہو گئے کمربستہ
کبھی جو پچھلے گنہ کا عذاب ٹلنے لگا

اچھی شاعری ہر دور میں بامعنی اور Relevent رہتی اور کبھی باسی یا آؤٹ آف ڈیٹ نہیں ہوتی۔ اب میں اس غزل کا ذکر کرنا چاہتا ہوں میں نے جس کے پیٹرن کو تبدیل کرنے کی بات کی تھی۔ یہ نظم کی طرح لکھی گئی غزل یا غزل کی طرح لکھی گئی نظم ہے مگر ان اشعار میں انہوں نے پیغمبرانہ بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے جو پیش گوئی کی وہ اتنی حیران کن ہے کہ مجھے نئے سرے سے "پری زاد" کی تاریخ اشاعت دیکھنا پڑی۔ یہ کتاب 1994ء میں چھپی تھی۔ بصرہ اور بغداد پر جو قیامت زمانہ حال میں گزری ہے اسے انہوں نے اتنا عرصہ پہلے کیسے دیکھ اور جان لیا۔ یہ اتنی واضح ہے کہ اس کی تشریح اور وضاحت کی ضرورت نہیں ملاحظہ کیجیے:

فلک سے دیکھ کر روتے ہوئے اجداد میرے
لہو اور آگ میں ہیں بصرہ و بغداد میرے
اُجڑتی مہ جبینیں نوجواں برباد میرے
لہو اور آگ میں ہیں بصرہ و بغداد میرے
کمانیں سب شکستہ رائیگاں فولاد میرے
لہو اور آگ میں ہیں بصرہ و بغداد میرے
مرے دشمن اکٹھے دوست بے بنیاد میرے
لہو اور آگ میں ہیں بصرہ و بغداد میرے
نہ جانے کس طرح ہوں گے کھنڈر آباد میرے
لہو اور آگ میں ہیں بصرہ و بغداد میرے
ذرا ڈھونڈو کوئی شہزادیاں شہزاد میرے
لہو اور آگ میں ہیں بصرہ و بغداد میرے

یہ درست ہے کہ بصرہ اور بغداد پر پہلے بھی قیامتیں ٹوٹتی رہی ہیں۔ ان کی بربادی پہلے بھی کئی بار ہو چکی ہے۔ مگر اس بار جیسے ہوئی اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ اس کو تباہ ہوتے دیکھ کر تو بی بی سی کے رپورٹر کی آواز بھی بھرا گئی تھی اور وہ چیخ پڑا تھا: They are destroying Baghdad

ان سب باتوں کے باوجود ہر اچھے اور بڑے شاعر کی طرح محمد اظہار الحق بھی مایوس دکھائی نہیں دیتے اور انہیں یقین ہے کہ:

اب آ کر ہاتھ کندھے پر رکھے گا وہ
زمانے ہو گئے گم صم کھڑا ہوں
کھو گئے ریگِ رواں میں جس کا گھوڑا اور شال
لوٹ آئے گا سفر سے وہ مسافر ایک دن

محمد اظہار الحق کی شاعری میں اگر چہ کہیں کہیں شراب انجیر و انگور کا ذکر ملتا ہے جو ظاہر ہے پاکیزہ شرابیں ہوتی ہوں گی۔ یوں بھی شاعری میں بادہ و ساغر کا ذکر کیے بغیر بات نہیں بنتی۔ مگر عام طور پر وہ شربت شہتوت اور اناروں کے رس ہی سے کام چلا لیتے ہیں اور ان کی شاعری میں پری زادوں اور غزالوں کا بھی کہیں کہیں ذکر موجود ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی شاعری روایتی عشق و محبت کی شاعری نہیں، یہ رات، شراب اور عورت کی شاعری ہے نہ ہی عورتوں سے باتیں کرنے تک محدود ہے۔ اس کے سوالات عالمگیر اور تاریخی سچائیوں پر مشتمل ہیں اور بڑے تناظر میں دیکھے جانے کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس کا موضوع مسلم تہذیب کی عظمت رفتہ ہے جسے وہ انسانیت کے لیے ایک مثالی تہذیب سمجھتے اور اس سے انسپاریشن لیتے ہیں اور جس کے زوال پر وہ دل گرفتہ ہیں۔ اب عظمت کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس میں شربت شہتوت یا شراب انجیر کی بھی گنجائش نہ ہو۔ تاہم وہ ماضی کی تہذیب ہی سے علامتیں انتخاب نہیں کرتے۔ اپنے عہد اور اپنی زمین سے بھی اتنا ہی پیار کرتے ہیں بلکہ ایک جگہ تو انہوں نے اس کو دوسری زمینوں پر ترجیح دیتے ہوئے کھل کر اس کا اظہار کیا ہے:

یہ سنگ مرمر، یہ شاخ انگور یہ کنیزیں
مگر کوئی کھینچتا ہے مٹی کے گھر کی جانب
آئینہ دیکھا تو یاد آیا گھروندا گاؤں کا
پیلے پیلے پھول کیکر پر کھلے ہوں گے بہت

وہ امن اور محبت کے شاعر ہیں اور معاشرے کو ہر طرح کے استحصال سے پاک اور ہر سطح پر انصاف کی حکمرانی دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں ان کی اس خواہش میں خود کو ان کا ہمنوا پاتا ہوں۔ یقیناً آپ بھی یہی چاہیں گے:

اک بار ملے بچوں یا پرندوں کو حکومت
کوئی ایسا طریقہ شہر ہوں خوشحال سارے

توکلی مست

عاشق رحیل

بلوچی زبان کے مجذوب شاعر توکلی مست بلوچستان کے مشہور قبیلے مری کے چشم و چراغ تھے۔ صوبہ سرحد کے خٹک قبیلے کی طرح اس قبیلے نے صرف جنگجو سپاہی ہی پیدا نہیں کیے بلکہ بڑے بڑے شاعروں اور دانشوروں کو بھی جنم دیا۔ جن میں گدو مراسی، مجار رحم علی مری، جمعہ کھوانی، میر محمد خان گزینی، میر ظریف اور جمال خاں وغیرہ شامل ہیں لیکن ان سب میں سے توکلی مست کا نام سرفہرست ہے۔ خٹک قبیلے کے خوشحال خان خٹک نے تو اپنی پوری زندگی قلم اور تلوار دونوں سے کام لیا لیکن توکلی مست ہتھیار چھوڑ کر صرف شاعری کرتے رہے۔ اگرچہ وہ ہتھیاروں کا استعمال بھی جانتے تھے لیکن وہ ایک صلح پسند انسان تھے اور امن پر یقین رکھتے تھے۔ ایک دفعہ مری اور بگٹی قبیلوں کے درمیان چلھوری کے مقام پر معرکہ آرائی ہوئی۔ دونوں طرف کے بہادر نوجوان میدان جنگ میں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ رواج کے مطابق توکلی مست بھی جنگ میں شرکت کرنے کے لیے گئے۔ ان کے بھائی علی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ مست یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ایک ہی رنگ، ایک ہی نسل اور ایک ہی تمدن کے لوگ ایک دوسرے کو مارنے مرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کو قتل کرنے کے لیے تیار ہے۔ ان کا ضمیر اس بات کو برداشت نہ کر سکا۔ ان کے اندر کے شاعر نے انہیں میدان جنگ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ توکلی مست کے علاوہ اگر کوئی اور بھگوڑا ہوتا تو قبائلی رسم و رواج کے مطابق سب سے پہلے انہیں ان کے اپنے لوگ ہی قتل کر دیتے لیکن مست خدا کے ایک برگزیدہ درویش تھے اس لیے کسی نے انہیں کچھ نہ کہا۔ ان کے بھائی علی اس معرکے میں مارے گئے جس کا انہیں انتہائی افسوس ہوا۔ چنانچہ وہ ہمیشہ کے لیے جنگ و جدل کے خلاف ہو گئے۔

بلوچستان کے یہ مایہ ناز شاعر توکلی مست مری علاقے کے مرکزی ''شہر کاہان'' کے شمال مغرب کی طرف واقع ایک گمنام سے گاؤں ''تاتر ک بند'' میں پیدا ہوئے۔ اس شاعر بے مثال کی وجہ سے اس گمنام سے گاؤں کا نام اب ہر وقت لوگوں کی زبانوں پر رہنے لگا ہے۔ توکلی مست کے والد صاحب کا نام لال خان تھا اور وہ اپنے قبیلے کی ایک اہم شخصیت سمجھے جاتے تھے۔ اُن کی مہمان نوازی اور حسن سلوک کا چرچا عام تھا۔ چھوٹی چھوٹی دور افتادہ میں اس ترقی یافتہ دور میں بھی تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست نہیں۔ چنانچہ آج سے ڈیڑھ سو سال قبل کے زمانے میں تو ایسے علاقے میں تعلیم کے حصول کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے توکلی مست بھی دوسرے بچوں کی طرح تعلیم نہ حاصل کر سکے۔ اس لیے بچپن ہی سے ان کے سپرد بھیڑ بکریاں چرانے کا کام کر دیا گیا لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں سوچ و فکر کی جو خوبی عطا کی تھی وہ اس میں ڈوبے رہتے اور مناظر فطرت کے حسن کو اپنے دل کی گہرائیوں میں اُتارتے رہتے۔ توکلی مست اکہرے بدن کے انسان تھے۔ ان کا قد بھی نسبتاً چھوٹا تھا۔ اس بات کا اندازہ ان کے ایک کرتے اور ہاتھ میں پکڑنے والی چھڑی سے ہوتا ہے۔ یہ دونوں تاریخی نوادر بگٹی قبیلے کے سردار نواب اکبر خان بگٹی کی ملکیت ہیں لیکن اس چھوٹے قد والے انسان نے بلوچی شاعری کا قد اتنا اونچا کر دیا کہ اُن کے بعد آنے والے شاعر اُن کے فن تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔

توکلی مست اور ان کی ہوش و خرد اُڑانے والی خوبصورت حسینہ سمو کی ان سے ملاقات مٹھا خان مری اپنی تصنیف ''سمو بیلی مست'' میں بڑے ڈرامائی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اس ملاقات کا احوال ان ہی کی زبانی سنئے '' رستراتی پہاڑ کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ پہاڑوں پر ہر طرف ایک پرشکوہ سکوت کا عالم طاری تھا۔ اچانک درّے سے چند سوار سفید براق لباس میں ملبوس، بگولے کی طرح گرد اُڑاتے ہوئے آ رہے تھے۔ تیز رفتار گھوڑوں کی ٹاپوں کی صدائیں وادی کی خاموش فضا میں ایک مہیب صدائے بازگشت پیدا کر رہی تھیں۔ یہ سوار مری قبیلے کے نوجوان تھے جو بندوقوں، تلواروں، ڈھالوں اور خنجروں سے لیس تھے۔ سواروں کا یہ دستہ ایک قبائلی مہم سر کرنے نکلا تھا۔ اچانک ساون کی گھٹاؤں نے وادی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ بارش کے آثار بڑھتے جا رہے تھے اس لیے مسافروں کا یہ قافلہ جلد از جلد کسی محفوظ مقام تک پہنچنا چاہتا تھا۔ تھوڑی ہی دور پہاڑ کے دامن انہیں ایک مکان نظر آیا۔ مسافر تیزی سے اس مکان کی طرف بڑھے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو صاحب خانہ نے بلوچی دستور کے مطابق ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور انہیں مہمانوں کے لیے مخصوص خیمے میں ٹھہرایا۔ آدھی رات کے بعد تیز و تند ہوائیں چلنے لگیں اور گرج چمک کے

ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ طوفانِ باد و باراں نے مہمانوں کے خیمے کی طنابیں ڈھیلی کر دیں۔ خیمے کو سہارا دینے والی لکڑی گرنے ہی والی تھی کہ گھر کی مالکہ سمو خوابِ ناز سے بیدار ہو کر خیمے کی طنابوں کو سنبھالنے کی جدوجہد میں مصروف ہوگئی۔ اچانک نیند سے جاگنے اور خیمے کو گرنے سے بچانے کی وجہ سے اُس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ اُس کی چادر سر سے سے ڈھلک کر شانوں پر آ گئی تھی۔ اس کی عنبرین زُلفیں اس کے شانوں پر پریشان تھیں۔ اسی اثنا میں بجلی کا کوندا لپکا اور اچانک توکلی مست کی نگاہیں سمو پر پڑ گئیں۔ سمو کا نظارۂ جمال ان کے خرمنِ ہوش و حواس پر برق بن کر گرا اور اس کے بعد وہ سمو کے جلوۂ حسن کے علاوہ اور کچھ نہ دیکھ سکے۔"

توکلی مست ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سمو کے ملکوتی حسن کے دیوانہ ہوگئے۔ انہوں نے باقی تمام رات اس اُمید پر جاگ کر گزاری کہ شاید پھر بجلی چمکے اور وہ ایک دفعہ پھر سمو کے حسن جہاں سوز کا جلوہ دیکھ سکیں۔ صبح ان کے ساتھیوں نے ان کی دگرگوں حالت دیکھی۔ ان کی آنکھیں سرخ تھیں اور وہ بے حد افسردہ اور مضمحل نظر آ رہے تھے۔ ان کی حرکات و سکنات اور باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں اور انہوں نے وہاں سے کہیں اور جانے سے انکار کر دیا۔ یہ کوئی فرضی قصہ نہیں۔ اس کی حقیقت توکلی مست نے خود ہی ایک نظم میں بیان کی ہے۔ میں اس نظم کے کچھ حصے کا ترجمہ پیش کرتا ہوں:

طوفانی ہوائیں اس کی چادر لے اُڑیں
میری دوررس نگاہوں نے اسے دیکھ لیا
اس کا دل موہ لینے والا سراپا
میری دوررس نگاہوں نے دیکھ لیا
اس کا رُخِ زیبا چراغوں کی مانند فروزاں تھا
زُلفیں سانپ کی طرح لہرا رہی تھیں
وہ اُٹھ ہوئے صحرا کی طرح رسیدہ خو ہے
تیغِ براں کی طرح تند تیز
مجھ پر جنونی کیفیت کا لرزا طاری ہوا
اُس دن سے میرا دل دیوانہ ہوگیا ہے
میں دنیا سے بیگانہ اور مست و مدہوش ہوگیا

سمو کے دامِ محبت کا اسیر ہونے کے بعد توکلی مست ہوش و خرد کھو بیٹھے۔ اُن کے جنون کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے اشعار میں برملا سمو کا نام لکھنے لگے۔ ہر معاشرے میں کسی شادی شدہ اور عصمت مآب سے کھلے بندوں عشق کے اظہار کی جسارت ایک سنگین جرم ہے۔ چنانچہ سمو کے شوہر اور اُس کے لواحقین نے توکلی کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ میر کرم خان مری قبیلہ کی بجارانی شاخ کے سربراہ تھے۔ انہوں نے جرگہ بلا کر توکلی کی صورت حال لوگوں کے سامنے رکھی۔ یہ قضیہ اپنی نوعیت کا پہلا اور عجیب واقعہ تھا۔ بحث و تکرار کے بعد جرگے نے متفقہ فیصلہ کیا کہ توکلی مست ایک خدا رسیدہ اور درویش صفت مجذوب انسان ہیں ان کی نیت میں کسی قسم کا کھوٹ نہیں۔ چنانچہ انہیں کچھ نہ کہا جائے اور انہیں ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔

توکلی مست نے حج بیت اللہ کا عزم کیا تا آنکہ اطمینانِ قلب نصیب ہو سکے۔ حج کے بعد ان پر جذب و مستی اور کیف و سرور کا ایک نیا عالم طاری ہوگیا۔ سمو کی محبت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور یہ دائرہ پھیل کر امن پسندی، قوم پرستی اور انسان دوستی میں تبدیل ہوتا گیا۔ چنانچہ مست امن پسندی اور وطن دوستی اور انسانی محبت کے ابدی نغمے الاپنے لگے۔ رفتہ رفتہ حجابات اُٹھتے گئے اور مست عشقِ حقیقی کے بلند مقام تک جا پہنچے۔ اس منزل پر پہنچنے کے بعد سمو محض ایک استعارہ اور علامت بن کے رہ گئی اور اسی استعارے کے پردے میں وہ اسرار و معانی عرفان و آگہی سرمدی نغمے الاپتے رہے۔

مست سمو کے شیدائی تھے۔ اس لیے سمو کے سراپا کا بیان، اس کے ہجر و فراق کا تذکرہ اُن کی شاعری کے دل پذیر عنوانات ہیں۔ ایک نظم کا ترجمہ دیکھیے جس میں وہ اپنی محبوبہ کا سراپا بیان کرتے ہیں۔

سمو زمین کے پیپل کے درختوں میں سے ایک ہے
سمو درختوں کا میوۂ نورس ہے
سمو ایک شیشۂ ناب ہے
سمو سنگلاخ چٹانوں کا ایک ہرن ہے
سمو انار کا گلِ سرخ ہے
سمو تاریکیوں میں ایک چراغ ہے
یا ہواؤں میں اُڑنے والا ابر ہے

توکلی مست کی ساری شاعری کا محور سمو ہی ہے۔ وہ اس کے حسن اور سراپا کو مدنظر رکھ کر کرشمہ کہتے ہے۔ اس کے حسن اور اپنے تخیل کو شامل کر کے وہ شاعری کے شاہکار پیش کر گئے۔ سمو کا نام ہر وقت ان کے ذہن پر چھایا رہتا تھا۔ توکلی کا عشق، عشق اور محبت کی دنیا کا ایک انوکھا اور منفرد واقعہ ہے۔ سمو کی محبت میں مبتلا ہونے کے بعد توکلی مست عجیب و غریب حرکات اور بے سروپا باتیں کرنے لگے تھے۔ وہ کسی کے ہاں مہمان ٹھہرتے اور ان کے لیے کھانا لایا جاتا تو میزبان سے سوال کرتے۔ سمو کا کھانا کہاں ہے؟ اس کے لیے کھانا نہیں لائے تو میں بھی نہیں کھاؤں گا۔ حیرت کی بات ہے کہ مجذوبیت اور مستی میں ڈوبے رہنے کے باوجود وہ ایک متقی اور عبادت گزار انسان تھے۔ اس لیے جب کبھی کوئی ان سے دعائے خیر کا

طالب ہوتا تو وہ کہتے ''سمو کی مرضی کے بعد ہی دعا کریں گے'' اس طرح ان کی ہر بات سمو سے ہی شروع ہوتی اور اسی پر ختم ہوتی۔ ایک اور نظم میں وہ اپنی محبوبہ کے حسن یوں پیش کرتے ہیں:

''صناع فطرت نے اسے موزوں اور متناسب بنایا جیسے کاریگر تیشے سے خم و پیچ درست کر دیتے ہیں میری محبوبہ ہنگام شام کی ایک قوس قزح ہے وہ پرنم بادلوں میں جلوہ فگن ہے وہ چودھویں کا چاند ہے جو پہاڑ سے طلوع ہو کر آسماں پر چھا جاتا ہے اور ہر طرف چاندنی پھیل جاتی ہے۔''

مست کی شاعری کی مقبولیت کا راز زبان کی روانی، شیرینی اور نغمگی میں پنہاں ہے۔ وہ نہایت آسان اور عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں۔ وہ تمثیلات اور تشبیہات کے بادشاہ تھے۔ وہ اپنے کلام میں اپنے ہی ماحول اور اپنی ہی سرزمین کی عکاسی کرتے تھے۔ وہ اپنی محبوبہ کے خرام ناز کو کبھی کبک سبک رفتار کی چال سے، کبھی آہوئے رمیدہ کی چوکڑی سے اور کبھی ناقہ تیز گام کی رفتار سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اپنی محبوبہ کی آواز کو کبھی صبح کے وقت بجنے والے ستارے کے نغموں سے کبھی تیز رفتہ شہنائیوں کی صدا سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اپنی محبوبہ کی پرخمار آنکھوں کو تیز تیز شعلوں کی لپک قرار دیتے ہیں تو کبھی اس کے ہاتھوں کے رنگ حنا کو چشمک برق بتاتے ہیں۔ اپنی محبوبہ کی تعریف میں انہیں مبالغہ سے بھی کام لینا پڑے تو وہ کر گزرتے تھے۔ ان کی ایک اور نظم کا ترجمہ حاضر ہے:

''میرے دل میں شعر موزوں کرنے کا جذبہ موجزن ہے۔ وہ (محبوبہ) اژدھے کی طرح پھنکارتی ہے۔ آہوئے رمیدہ کی طرح دور جا کر کھڑی ہوتی ہے۔ ناقہ سیار کی طرح تیز رو ہے۔ بلند بانگ شہنائیوں کی طرح خوش آہنگ ہے۔ چشمک برق کی طرح چمکتا ہے۔ اس کے ہاتھوں کی مہندی شعلوں کی طرح دہکتی ہے۔ قریب المرگ مریضوں کو شفا بخشتی ہے۔ اڑتے پرندوں کو ہاتھوں سے پکڑ لیتی ہے۔ بے ہوش دیوانوں کو ہوش میں لاتی ہے۔ آوارہ فقیروں کو مست بنا دیتی ہے۔ رمیدہ خو آہوؤں کو رام کر لیتی ہے۔''

مست اپنی محبوبہ کے قامت کو سرو قد نہیں کہتے۔ اسے صنوبر یا شمشاد سے تشبیہ نہیں دیتے۔ کیونکہ انہوں نے یہ درخت دیکھے ہی نہیں۔ اُن کے علاقے میں ہوتے ہی نہیں۔ اس لیے وہ زین پہاڑ کے پیپل یا جاندران پہاڑ کے نیمو کے درخت سے تشبیہ دیتے ہیں جو ہر وقت اُن کے مشاہدے میں رہتے تھے۔ وہ اس پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ درخت کے تمام حصوں کو محبوب کے مختلف اعضاء سے تشبیہ دیتے ہیں۔ جیسے زلفوں کو شاخوں سے۔ اُس کے چہرے کو درخت کے بیضوی پتوں سے اور اُس کی کمر کو نرم و نازک اور لچکدار شاخوں سے۔ ان کی شاعری پڑھ کر دیکھیے آپ کو توکلی مست کا اپنا ایک الگ رنگ نظر آئے گا۔ وہ ایک جداگانہ آہنگ، خاص اسلوب اور منفرد انداز بیان کے مالک ہیں۔ ان کی شاعری قوس قزح سے رنگ لیے ہوئے ہے۔ ان کے کلام میں ہمہ رنگی اور ہمہ جہتی موجود ہے۔ وہ اپنے سے پہلے آنے والے شاعروں شہ مرید کا سوز و گداز، بیورغ کی بلند آہنگی، جام کی طرح نزاکت تخیل رکھتے ہیں۔ سید وارث شاہ صاحب سے پہلے آنے والوں نے ''ہیر رانجھے'' کا قصہ منظوم کیا لیکن جو شہرت دوام ان کے قصے کو ہوئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ یہی حال توکلی مست کا ہے۔ ان سے پہلے آنے والے شاعر بھی یہی مضمون باندھ گئے ہیں لیکن جو رفعت اور سوز و گداز توکلی کے کلام میں ملتا ہے وہ اس تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ یہ ان کی محبوبہ سمو کی دین تھی جو انہیں مست بھی بنا گئی اور بلند تخیل کا خزانہ بھی دے گئی۔

توکلی مست تو ضرور تھے لیکن وہ دنیا والوں اور ان کے مسائل سے غافل نہیں تھے۔ یہاں تک کہ وہ تو جانوروں اور اپنے علاقے کے چرند پرند کی ضروریات سے بھی فکرمند رہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کہاں کہاں کے لوگ خشک سالی کے باعث پریشان ہیں اس لیے وہ بادلوں سے کہتے ہیں کہ انہیں کہاں کہاں برسنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ بلند و بالا پہاڑوں پر برس کر پہاڑی بکروں کے لیے پانی مہیا کریں جو پیاس کی وجہ سے بے قرار ہیں۔ دریائے ''بیجی'' کا پانی خشک ہو چکا ہے اس لیے وہ بادلوں سے التجا کرتے ہیں کہ وہ کھل کر برسیں تاکہ دریائے ''بیجی'' میں طغیانی آجائے۔

توکلی مست کو جزئیات نگاری میں کمال حاصل تھا۔ بلوچی زبان کی ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ ''وائے وطن خشکیں دار'' یعنی وطن کی خشک شاخ پر بھی قربان۔ مجذوب شاعر توکلی مست کو بھی اپنے وطن کے ذرّے ذرّے سے محبت تھی۔ وہ اپنے شعروں میں وطن عزیز کے بلند و بالا پہاڑوں، صحراؤں، بیابانوں، پرپیچ ریگزاروں اور بے آب و گیاہ میدانوں کے نغمے گاتے ہیں۔ خانہ بدوشی اور نقل مکانی بلوچوں کی زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ توکلی موسم سرما میں جب بھی سندھ کی طرف نقل مکانی کیا کرتے تھے تو وہ وہاں سے واپس آنے کے لیے بے تاب ہو جایا کرتے تھے۔ وسیع پیمانے پر نقل مکانی کے باعث علاقے کے بہت سارے مقامات ویران ہو جاتے ہیں۔ شاعر ان غیر آباد مقامات کے مکینوں کے وہاں دوبارہ آباد

ہونے کی خواہش کیا کرتے تھے تاکہ علاقے کی رونقیں بحال ہو جائیں۔ لوگ پہاڑوں کے سبزہ زاروں میں بھیڑ بکریاں چرائیں اور کاشتکار زرخیز میدانوں میں فصلیں اُگائیں۔ اُن کی ایک نظم کی چند لائنیں دیکھیں:

''دوست دور دراز کے علاقوں سے واپس آ جائیں۔ اپنی پرانی جگہوں پر ڈیرے ڈالیں اور وہیں پر اقامت کریں۔ بھیڑیں پہاڑوں پر میں میں کرتی پھریں اور جوار کی فصل روئی کے قابل ہو جائے۔''

مست ایک سیلانی درویش تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت سیر و سیاحت میں ہی گزرتا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتے اپنے شعروں میں وہاں کے پہاڑوں، دریاؤں اور ندی نالوں کا تذکرہ ضرور کرتے۔ ان ہی کے کلام سے بہت سی جگہوں کا پتہ چلتا ہے۔ جیسے دریائے بیجی، بولان ندی، مرغ کھور اور کاہگزی ندی وغیرہ۔ ان کی شاعری میں بلوچستان کے اتنے پہاڑوں کے نام آتے ہیں کہ باقی تمام شاعروں کے مجموعی کلام میں بھی ان پہاڑوں کے عشرِ عشیر کا تذکرہ بھی نہیں مل سکتا۔ نام ہیں رستزائی، بانبور، زین، جاندران، کوہ سلیمان، کوہ بیہو تھدڑی، کیڑی کوہ، ڈانٹر، راس کوہ، مثرونگان، اور روتھمڑ وغیرہ۔ مست نے نہ صرف ان پہاڑوں کے نام گنوائے ہیں بلکہ ان میں پائے جانے والے شکاری جانوروں، پرندوں ان پر اُگنے والے قسم قسم کے درختوں کا بھی بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جیسے کبیر، لیمو، زامر، انجیر، کھول، میرروزان وغیرہ۔ ان کے شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے صرف بلوچستان کے مختلف حصوں کی سیر و سیاحت نہیں کی بلکہ وہ سندھ اور ڈیرہ غازی خان کے راستے لاہور اور دہلی تک بھی گئے۔ انہوں نے اپنے شعروں میں جن علاقوں اور شہروں کا ذکر کیا ہے اُن کے نام یہ ہیں۔ سبّی، ڈھاڈر، شکاف، بطلان ناکس، شاہرگ، بیری بورو، ماوند، بادراہ، منجھرا، پوار، مجھاڑ، سنگ سبیلا، جھبری، بارکھان، کچھی، مکران، سیوہان، چوکی، ڈیرہ غازی خاں، ملتان اور لاہور خصوصیت سے ذکر کے قابل ہیں۔

توکلی مست صرف سمو کی مجازی محبت کے مست ہی نہیں بلکہ وہ تصوف کے راستے کے بھی راہی تھے۔ وہ سیر و سیاحت کے ساتھ ساتھ اپنا بہت سا وقت عبادت اور ریاضت میں بھی گزارتے تھے۔ وہ اپنے علاقے کے بلند و بالا پہاڑوں کی پرسکون غاروں میں بیٹھ کر ذکر و فکر اور یادِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے اور روحانی منازل طے کرتے تھے۔ اپنی ایک نظم میں وہ کہتے ہیں:

''میں پہاڑ میں بیٹھ کر شتاہی روزے رکھوں گا۔ کھانا پینا سودمند ہے لیکن خدا کی راہ میں دیا ہوا آخرت کا توشہ ہے۔ میں روز و شب مالک کا ذکر کرتا ہوں۔ خدا کی بارگاہ میں آہ و زاری کرنا اچھا ہے تاکہ گناہ بخشوائے جا سکیں۔''

وہ ساری زندگی روحانیت کے گیت الاپتے رہے۔ الوہیت کے نغمے گاتے رہے اور عرفان و آگہی کی جوت جگاتے رہے۔ انھوں نے نہ صرف زندگی زہد و اتقا میں گزاری بلکہ دوسروں کو بھی معرفتِ الٰہی کا درس دیتے رہے۔ انہوں نے ادب کے چمنستان میں تصوف اور معرفت کے ایسے رنگ برنگے پھول کھلائے ہیں جن کی مہک آج بھی مشامِ جان کو معطر کرتی ہے۔ توکلی مست کی داستانِ عشق کی شہرت کے ساتھ ساتھ ان کے حسنِ کلام اور زورِ بیان کے بھی ہر جگہ چرچے ہونے لگے۔ ان کی محفلوں میں بڑے بڑے قبائلی سردار، دانشور اور شاعر شریک ہوتے تھے۔ اظہارِ عقیدت مندی کے طور پر بڑے بڑے عالی مرتبت سردار، نواب اور قبائلی سربراہ انہیں اپنے ہاں مدعو کرنے لگے۔ ان کی نیک دعاؤں اور شاعرانہ خیالات سے فیض حاصل کرنے لگے۔ میر امام بخش رند، نواب جمال لغاری، نواب غلام مرتضیٰ خان بگٹی، سردار گزین خان مری اور محمد خاں گشکوری سے اُن کے گہرے مراسم تھے۔

مست کی محبوبہ سمو تقریباً 1850ء میں فوت ہوئی۔ اس کی وفات کا سانحہ ان کے لیے ایک ناقابل برداشت صدمہ تھا لیکن وہ ایک حوصلہ مند اور راضی برضا انسان تھے۔ چنانچہ انہوں نے قدرت کے اس فیصلے کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ ہر چند کہ وہ صبر و رضا کے پیکر تھے لیکن سمو کی وفات کی وحشت انگیز خبر نے ان کے اعصاب جھنجھوڑ کر رکھ دیے اور وہ بے اختیار کہہ اٹھے:

''خنجر لے آؤ کہ میں اس دل کے پار اُتار لوں اور سمو کے گھر کو خونِ دل سے رنگین بنا دوں۔''

مست توکلی 1896ء میں فوت ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً 65 سال تھی۔ اس طرح توکلی مست کا عہد جو بلوچی زبان کے فروغ اور ترقی کا ایک زرین عہد تھا ختم ہوا۔ وفات سے پہلے انہوں نے وصیت کی تھی کہ ان کی میت ایک اونٹ پر لادی جائے اور جہاں یہ اونٹ بیٹھ جائے ان کی میت وہیں دفن کر دی جائے۔ چنانچہ ان کی وصیت کے مطابق ان کا جنازہ ایک اونٹ پر رکھا گیا۔ کافی چلنے کے بعد وہ اونٹ ایک وسیع و عریض میدان میں بیٹھ گیا جہاں سے اسے اُٹھانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی لیکن وہ وہاں سے نہ اُٹھا۔ چنانچہ انہیں وہیں دفن کر دیا گیا اور مست کے نام کی رعایت سے اُس میدان کا نام ''مست میدان'' رکھا گیا۔ اُن کا مزار بھی مرجع عام و خاص ہے جہاں ہر وقت زائرین کا میلہ لگا رہتا ہے۔

میرا جی

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

’’میرا جی‘‘ کا کام اُردو ادب پر منقش حروف میں کندہ ہے۔ میرا جی اُردو ادب کے حافظہ کے نہاں خانوں سے ایک عطر بیز موج کی شکل میں برآمد ہوتا ہے۔ عالمِ بالا کی سریلی موسیقی کی طرح سلسبیل کی ایک لطیف لہر کی مانند بہار میں پھوٹی نئی کونپل کی مانند صحرا میں سایہ کی مانند ’’میرا جی‘‘ پچھلی صدی سے گوشِ دوام میں ایک نعرہ ایقان بن کر ادب پر چھائے رہے۔ میرا جی موجودہ صدی کا معاصر ہے۔

’’میرا جی‘‘ نوآبادی نظام کی جگہ داخلی طور پر منظم و متحد ہند اسلامی تہذیب اور اُس کی جگہ اسلامی اور یورپی تہذیبوں میں ہم آہنگی اور ٹکراؤ کے بیاپے سے متعارف ہوئے کچھ تہذیبیں اپنے ماضی کو ساتھ رکھے ہوئے تھیں تو کچھ تہذیبیں ماضی سے چھٹکارا حاصل کر رہی تھیں۔ میرا جی نے اپنے داخلی اور خارجی احساسات کا اظہار نظم، غزل، تنقید اور ترجمے میں بھرپور انداز میں کیا ہے۔

بیدلؔ، غالبؔ، فیضؔ اور راشدؔ کے اسلوب سے الگ اور مختلف ثناء اللہ ادبی دُنیا کا ’’میرا جی‘‘ جس نے ہماری شعری روایت کو ایک نیا طرز دیا۔ صرف چالیس برس سے کم زندگی کی بہاریں دیکھ پائے۔

میرا جی ایک ذہین اور وسیع المطالعہ شخص تھے۔ اُن کے والد ریٹائر ہو کر لاہور آئے تو انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں میرا جی کی نظمیں گونجنے لگیں۔ لوگ ان کی نظمیں سنتے اور ’’میرا جی‘‘ پر ہنستے تھے۔ فقرے کستے تھے۔ ’’میرا جی‘‘ ابلاغ و اظہار پورے قد اور خلوص سے کر رہے تھے۔ وہ اپنا ادبی فریضہ ذمہ دار پہرہ دار کی طرح نبھا رہے تھے۔ وہ شاعر، تنقید نگار اور مترجم تھے۔ ان کے تراجم ادبی خزانہ کو اپنے لوگوں کے اذہان و قلوب کی زرخیزی کا باعث بن رہے تھے۔ اُن کے تراجم میں ’’خیمے کے آس پاس‘‘ اور ’’نگار خانہ‘‘ شامل ہیں جو کہ اُردو ادب کا اثاثہ ہیں۔

تنقید میں ’’مشرق و مغرب کے نغمے‘‘، ’’میرا جی‘‘ مغربی تہذیب و ثقافت، مشرقی تہذیب و ثقافت میں ہم آہنگی اور ٹکراؤ میں اپنے داخلی، خارجی احساسات کو رقم کیا۔ شاعری میں ’’میرا جی کے گیت‘‘ میرا جی کی نظمیں گیت ہی گیت، پابند نظمیں، تین رنگ اور کلیات میرا جی اپنی مثال آپ ہیں۔ میرا جی کے عشق کا محور کوئی خیالی محبوب نہیں بلکہ ’’میرا سین‘‘ ایک بنگالی لڑکی سے تھا اور ’’میرا سین‘‘ کو آخر تک اس عشق کی خبر نہ ہو سکی۔ میرا سین ان کی زندگی میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کی وجہ سے ہی وہ ثناء اللہ ڈار سے میرا جی بنے۔ اسی عشق لا حاصل میں انھوں نے اپنی زندگی کا پورا لائحہ عمل بدل دیا اور خود کو ایک نئے رنگ روپ میں منتقل کیا جو اُن کی شخصی انفرادیت کا باعث بنی۔ بعد میں ان کی شاعری میں بھی ایسے انوکھے لگاؤ کی مختلف صورتیں اظہار پذیر ہوتی ہیں۔ بلکہ ان کے کلام میں اساسی حیثیت کی حامل ہیں۔

جیکسن بلیک، فرائیڈ نے نظریۂ لاشعور اور علم النفسیات میں جن جنسی اور نفسی کیفیات کو سلجھانے کی کوشش کی۔ ’’میرا جی‘‘ کی نظموں میں یہ موضوعات بھرپور پائے جاتے ہیں۔ میرا جی فرائیڈ کے شعور اور تحت الشعور، جنسی اور نفسی کیفیات کو اپنی نظموں کے ذریعہ واضح کرتے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ جنسی فعل ان کے لیے کبھی بھی تسلی اور اطمینان کا سبب نہیں رہا۔ وہ عورت اور جنس دونوں سے خائف زندگی کی راہ پر گامزن ہیں۔ جنسی نظموں میں ان کی ذات کا پورا انکشاف نہیں ہوتا۔ میرا جی کی نظموں میں ’’مرد‘‘، ’’مسافر‘‘ ہے جب کہ عورت سکون سے مالا مال عشرت خیز سرائے ہے۔ بقول میرا جی:

رسیلے جرائم کی خوشبو
مرے ذہن میں آ رہی ہے
قوانینِ اخلاق کے سارے بندھن شکستہ نظر آ رہے ہیں
حسین اور ممنوع جھرمٹ مرے دل کو پھسلا رہے ہیں
نسائی میہوں کی ہر ایک موتی آنچ کرتی ہے سازش
مرے دل کو بہکا رہی ہے
رسیلے جرائم کی خوشبو
مرے ذہن میں آ رہے ہیں

میرا جی اپنی ان نظموں میں مرد کو صرف جذبات کا غلام اور عورت کو صرف اور صرف مرد کی خوشنودی کا جواز سمجھتے ہیں۔ میرا جی کی نظموں میں عورت عشرت خیز سرائے اور مرد ’’مسافر‘‘ ہے۔ میرا جی کی نظم ’’مسافروں کی تلاش‘‘ اسی موضوع کا عکس ہے۔ جب

کہ ''دوسری عورت'' بھی اسی موضوع کا اظہار ہے۔

میرا جی کی تخلیق ''رنگیلے رسیا''، ''اخلاق کے نام'' میں عیش پرستوں کی منظرکشی کا مظہر ہے۔ اسی طرح ''میرا جی'' نے اپنی نظم ''حادثہ'' میں بظاہر نیک شخص کو پیش کیا ہے۔ تنقید نگاروں نے میرا جی کی انھی تخلیقات کو دیکھا ہے۔ جب کہ میرا جی جنسی نظموں کے علاوہ اپنی دوسری تخلیقات میں زیادہ واضح اور فنی لحاظ سے اُبھر کر سامنے آئے ہیں۔ شاید یہی نظمیں میرا جی کا سرمایۂ شعر ہیں۔ ان نظموں میں ''سمندر کا بلاوا'' اور ''اے پیارے لوگو'' غزلوں کا بھرپور اظہار میرا جی کی ارفع اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔ اس کے علاوہ میرا جی نے اپنی نظموں میں انسانیت کی مظلومیت کا ماتم بھی جگہ جگہ کیا ہے۔

معاشرہ کی طرف سے ہمیشہ میرا جی کو تنقید کا سامنا رہا ہے۔ کیونکہ انھوں نے ہمیشہ معاشرتی حدود و قیود کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنے انداز سے زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی جہاں ان کی ظاہری ہیئت کذائی لوگوں کے لیے انوکھے پن کو ظاہر کرتی رہی۔ وہیں ان کی شاعری میں نیا علامتی نظام جنسی تلازمات بھی متوجہ کرتے رہے۔ ان کی منظومات کو ہمیشہ سطحی انداز سے پرکھنے کی کوشش کی جاتی رہی اور بین السطور پنہاں نفسیاتی گرہوں کو کھولنے کی زحمت نہیں کی گئی۔ اسی وجہ سے سطحی اذہان اور محدود علمی وفکری بصیرت کے حامل اشخاص کو ان کے کلام میں سطحی پن کا شائبہ گزرا۔ تاہم آہستہ آہستہ ان اعتراضات کی گرد اُن کے کلام سے چھٹتی جا رہی ہے۔ تاہم ان کی ظاہری شکل وصورت متنازعہ رہی ہے۔ اس میں میرا جی کی اپنی شعوری کوشش بھی نظر آتی ہے کہ انھوں نے خود کو معاشرے کے سامنے اس رُوپ میں پیش کیا جس سے لوگ ان کے بارے میں طرح طرح کے قیاس اور آراء قائم کرتے رہیں۔ لوگوں کی تنقید، استہزا کو وہ کبھی خاطر میں نہ لائے اور نہ ہی کبھی کسی کی نصیحت کو خاطر میں لا کر اپنی روش بدلنے پر آمادۂ خاطر ہوئے۔ مالی معاملات میں غیر متوازن انداز اختیار کرنے کی وجہ سے ان کی زندگی کبھی بھی آسودہ نہیں رہی۔ غربت، حسرت، کثرت، شراب نوشی اور مفلسی نے میرا جی کو زندگی کا جو رُوپ پیش کیا وہ ان کی نظم ''نادار''، ''ہندی جوان'' اور ''کلرک کا نغمۂ محبت'' میں نظر آتا ہے۔ ان نظموں میں معاشرہ کے پسے اور محروم طبقہ کے مسائل اور وسائل کے علاوہ مصائب و آلام، زندگی کی اذیتوں اور تلخیوں کا بے رحم بیانیہ ہے۔

سب رات مری سپنوں میں گزر جاتی ہے اور میں سوتا ہوں
پھر صبح کی دیوی آتی ہے
اپنے بستر سے اُٹھتا ہوں منہ دھوتا ہوں
لایا تھا کل جو ڈبل روٹی
اس میں سے آدھی کھائی تھی
باقی جو بچی وہ میرا آج کا ناشتہ تھی

میرا جی کی نظم ''ابوالہلال'' جو کہ ۲۲ سال کی عمر میں لکھی، فارسی استعمال کا حسین امتزاج ہے جب کہ میرا جی کے اسلوب کی ایک نمایاں خوبی ان کے ہندی الفاظ جو کہ بکثرت استعمال کیے ہیں۔ میرا جی کی بیشتر نظموں میں لفظیات کے استعمال میں ہندی سے جہاں لگاؤ نظر آتا ہے وہیں ان کی نظموں میں مجموعی فضا بھی ہندوستانی تہذیب وثقافت سے ان کے لگاؤ کی غماز ہے۔ وہ اپنی نظموں کی بنت میں ہندی عناصر کو محسوس اور نامحسوس انداز میں شامل ہونے سے روک پاتے۔ یہی چیز ان کی اپنی مٹی سے اُنسیت اور محبت کو ظاہر کرتی ہے۔ ساتھ ہی یہاں ان کی ہندوستانی دیومالا، صنمیات، مذہبی اعتقادات سے واقفیت بھی نظر آتی ہے۔ ان کی یہی علمیت اور مطالعے سے گہرا شغف جب نظموں میں اظہار کی راہ پاتا ہے تو ایک نیا تخلیقی تجربہ اور اسلوب دیکھنے میں آتا ہے۔

پیچھے پیچھے لاکھ شکاری آگے ایک شکار
دھن گن 'گیان' بھی کام نہ آئے
نام ہری کا جپتا جائے
اپنی سی وہ کیے جائے گا کرلوتا تیا چار

میرا جی کے تخلیقی کام کو تاریخ اُردو ادب نظر انداز نہیں کر سکتی۔ نقادوں نے میرا جی کی علمی فضیلت اور مطالعے کی وسعت، انگریزی ادبیات سے لگاؤ اور فرانسیسی شعراء کے تراجم کے حوالے سے تشکیل دیا۔ یا دب نظر انداز کیا ہے جب کہ ادھورے نفسیاتی تجزیوں نے میرا جی کی زندگی کو پُراسرار کر دیا اور ہمارے نقادوں کو صرف یہی نظر آئے۔

میرا جی صرف چالیس سالہ زندگی گزار کر سایوں کی دُنیا چھوڑ کر اس شمع نورِ قدرت کے سربستہ رازوں کو آشکار کرتے ہوئے کہیں دور بہت دور جا بسا جہاں سے کبھی کوئی نہیں لوٹا۔ میرا جی کی متلاشی بے قرار رُوح اپنی منزل پا چکی۔ شعر و ادب کا یہ بحری سیاح اپنی بندرگاہ مراد کو پہنچ چکا ہے مگر اُس کی نظمیں، غزلیں، تراجم......

بقول میرا جی:

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا
کیا ہے تیرا کیا ہے میرا اپنا پرایا بھول گیا

''امراؤ جان ادا'' معاشرتی تہذیب کا زوال اور لکھنوی دور

عائشہ مشعل/لاہور

ناول انگریزی زبان کا لفظ ہے اس کے معانی نئی اور انوکھی چیز کے ہیں لفظ ناول اطالوی لفظ ''نوویلا'' سے ماخوذ ہے اس میں فلسفہ زندگی کی جھلک ہوتی ہے مرزا محمد ہادی رسوا کا ناول امراؤ جان ادا اردو ادب کا ایک شاہکار ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ رسوا نے اس ناول میں لکھنوی معاشرت کی عکاسی کی ہے اُس وقت لکھنؤ اخلاقی و سیاسی لحاظ سے ایک زوال پذیر معاشرہ تھا اس ناول میں معاشرے کے جس طبقے کی عکاسی کی گئی ہے ان میں چکلے' طوائفیں' نغمہ خواں' زردار' نواب' ضمیر فروش' ڈاکو' بدمعاش اور بدکردار لوگ شامل ہیں بدکرداری اور بدمعاشی کا پہلا کردار دلاور خان ہے جو ایک شریف گھرانے کی بیٹی کو ذاتی انتقام کی خاطر خانم (ایک طوائف) کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے یہاں پر رسوا نے محاکات سے کام لیتے ہوئے زوال پذیر معاشرے کے ایک گندہ ذہن آدمی کی تصویر اپنی متحرک تحریر کی بدولت بیان کی ہے اس کے علاوہ لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے میں بدکاری کے عنصر کو بخوبی بیان کیا ہے رسوا کی تحریر میں مکمل جاذبیت ملتی ہے اس ناول میں ایک بدمعاش کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

''دلاور خان' جس کا مکان ہمارے مکان سے تھوڑی دور تھا' موا ڈکیتیوں سے ملا ہوا تھا لکھنؤ میں برسوں قید رہا اسی زمانے میں نہیں معلوم کس کی سفارش سے چھوٹ آیا تھا ابا سے سخت عداوت رکھتا تھا''(۱)

اس مثال سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں معاشی بحران تھا جس سے پیسے والے لوگ امیری کے نشے میں غلط کام کرنے کے باوجود سزا سے بچ نکلتے تھے امراؤ نے اپنی کہانی بیان کرتے ہوئے بھی کچھ ایسے عناصر کا ذکر کیا ہے جو بچوں کی معصومیت سے فائدہ اٹھا کر انہیں اغواء کرنے کے بعد غلط کاری کی طرف راغب کرتے ہیں:

''ایک دن اُس نے ابا کا ایک کبوتر اُڑا لیا لینے گئے نہ دیا چار آنے دیتے تھے وہ آٹھ آنے مانگتا تھا ابا تو نوکری پر چلے گئے جھٹ پٹے وقت خدا جانے میں گھر سے کیوں نکلی تھی دیکھتی کیا ہوں املی کے نیچے کھڑا ہوا ہے کہنے لگا'' چلو بیٹا تمہارے ابا پیسے دیتے گئے تھے' کبوتر لے لو میں اُس کے دام میں آگئی ساتھ چلی گئی''(۲)

اس کے بعد دوسرا نقطہ ناول میں جسم فروش عورتوں اور ان کے ضمیر فروش عاشقوں کا ہے لکھنؤ کی عوام کا چونکہ اب یہی مشغلہ تھا اس لیے وہاں کوٹھے میں رہنے والیوں کے لیے خاص اہتمام کیے جاتے ناول میں بتایا گیا ہے کہ اس دور میں کوٹھے کیسے ہوتے تھے وہاں بیٹی کی ماں نہیں ہوتی اور ماں کی بیٹی نہ ہوتی بھائی کی بہن نہ ہوتی سب کے سب ایک دوسرے کے یار ہی ہوتے رسوا رقم کرتے ہیں:

''سب گہنے پاتے سے آراستہ' ہر وقت بنی ٹھنی' تو الوں جوڑے پہنے سادے کپڑے جو ہم لوگ روز مرہ پہنے رہتے تھے وہ اور رنڈیوں کو عید بقر میں نصیب نہیں ہوتے تھے خانم کا مکان کیا تھا ایک پرستان تھا جس کمرے میں جا نکلو سوائے ہنسی مذاق' گانے بجانے کے کوئی اور چرچا نہ تھا اگرچہ میں کم سن تھی اپنے مطلب کی سب سمجھتی تھی''(۳)

یہاں پر گفتگو ایک مہذب معاشرے کی طرح کی جاتی مگر نظر اور دل میں سوائے ہوس کے کچھ نہ ہوتا خانم کے کوٹھے پر ہر قسم اور ہر عمر کے لوگ آتے ہیں خانم کا کردار ایک ماہر نفسیات کا ہے جو کسی مجبور و مانوس شخص کے جذبات و احساسات کو بخوبی سمجھ کر حتی المقدر کی حمایت وتحفظ کے لئے ہمدرد ثابت ہوتا ہے یہ ایک سلجھی ہوئی اور سگھڑ رنڈی ہے جو مغویہ لڑکیوں کی نہایت احسن انداز سے پرورش کرتی ہے آداب معاشرت و مجالس سے بہرور کرواتی ہے آخر میں ان کو متمول عیاش لوگوں کی ہوس میں چھوڑ دیتی ہے اور انہیں جوان کر کے نوابوں کے روبرو پیش کرتی ہے مرزا رسوا نے لکھنؤ اور کانپور کے رہنے والے مہذب لوگوں کی آئینہ داری بھی کی ہے جہاں بڑے بڑے صاحب ثروت لوگ رہتے ہیں اور گھر میں ہر قسم کی نعمت ہونے کے باوجود کوٹھوں پر اپنی دولت برباد کرتے ہیں

رسوا نے لکھنؤ اور کانپور جیسے اعلیٰ شہروں کے زوال کا سبب اُن لوگوں کو قرار دیا ہے جو کسی بھی معاشرے کے لیے ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں کہ جو غلط کاموں سے باز نہیں رہتے رسوا نے اس ناول میں ادبی سرقہ کرنے والے لوگوں کی بھی نشاندہی کی ہے کہ اس دور میں لوگ شاعری چوری کر کے اپنا نام بناتے تھے رنڈی خانے کے عام و خاص بظاہر تو نہایت نرم مزاج لوگ معلوم ہوتے تھے مگر ان کی روح درندہ صفت تھی۔ رسوا نے اس ناول کے ذریعے لکھنؤ شہر کی شاعرانہ خصوصیات کو ظل دیا ہے باب اول میں غزلیات ہیں جبکہ بعد کے ابواب کا آغاز ہی خوبصورت اشعار سے کیا ہے امراؤ کی طرح لکھنوی عوام کو شاعری سے لگاؤ تھا:

کس کو سنائیں حال دل زار اے ادا
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی (۴)

رسوا نے لکھنوی تہذیب کی عکاسی میں ظرافت کا پہلو بھی ڈالا ہے اور لوگوں کو معاشرتی زوال کا قصور وار ٹھہرایا ہے اس ناول میں ۱۸۵۷ء سے ذرا پہلے لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح میں جو بدامنی' بدنظمی' اور فتنہ و فساد ہوا تھا اس کی جھلک دکھائی ہے غدر کے بعد لکھنؤ کی خوشحالی پر جو قیامت ٹوٹی اور شاہی خاندان کی بیگمات دوسرے پر جو ظلم ہوئے' فتح کے بعد انگریزوں کے قابض ہونے کا حال بہت تفصیل سے بیان کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ناول امراؤ جان ادا کا موضوع طوائف کی زندگی نہیں بلکہ لکھنؤ کا زوال پذیر معاشرہ ہے

حوالہ جات: ۱۔مرزا محمد ہادی رسوا' امراؤ جان ادا 'لاہور' مشتاق بک کارنر' س ن' ص ۲۹
۲۔ایضاً ص ۳۱ ۳۔ایضاً ص ۴۴
۴۔ایضاً ص ۷۱

امرتا پریم اور امروز کا عشق

دستگیر شہزاد/ٹوبہ ٹیک سنگھ

امرتا پریتم اور امروز تقریباً چالیس برس اکٹھے رہے۔انہوں نے شاید شادی نہ کی تھی۔وہ خاوند اور بیوی تھے تو نہ ہی دوست یا رفیق کہنا اُن کے ساتھ انصاف تھا۔وہ کسی ایسی سطح پر ایک دوسرے کے ہو چکے تھے جس رشتے کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ان درختوں کی طرح جو الگ الگ کھڑے ہوں لیکن زمین کے اندر جن کی جڑیں آپس میں گتھ گئی ہوں۔امرتا اب اس دنیا میں نہیں مگر اپنی شاعری میں زندہ ہیں۔اب تو وہ امروز کی نظموں میں بھی سانسیں لے رہی ہیں۔حال ہی میں امروز نے اپنی پنجابی نظموں کا پہلا مجموعہ مجھے بھیجا تو میں حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ پہلے تو میں کتاب کے ظاہری حُسن پر فریفتہ ہوا اتنی خوبصورتی سے چھپی ہوئی کتابیں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔جب پڑھنا شروع کی تو پنجابی پڑھنے کا ریاض نہ ہونے کے باوجود پڑھتا چلا گیا۔اعلیٰ شاعری کے نمونے زندگی سے شرابور ایسا محسوس ہوا امروز نے امرتا سے جسمانی طور پر الگ ہو کر آنسو نہیں بہائے۔یہ کویتائیں لکھی ہیں۔شاید جب وہ اکٹھے رہتے تھے تب بھی ساتھ ہی ایک الگ دنیا بھی انہوں نے بسا رکھی تھی۔ جشن کا ماحول تھا۔اب بھی امرتا کے جانے کے بعد بھی وہ جشن جاری ہے۔ممکن ہے اسی وجہ سے امروز نے اپنے شعری مجموعہ کا نام "جشن جاری ہے" رکھا ہے۔ان نظموں میں اس نے امرتا کو ہی لکھا ہے۔پہلے ہی صفحہ پر دو سطروں کی نظم ہے۔

تم حرف حرف نظم
اور نظم نظم زندگی

آگے امرتا کی ایک خوبصورت تصویر کے سامنے والے صفحے پر یہ چھوٹی سی نظم ہے:

کبھی کبھی
خوبصورت سوچیں
خوبصورت جسم بھی
دھارن کر لیتی ہیں

محسوسات کا یہ اظہار بے مثال تصویر کشی ہے۔ پنجابی زبان کی یہ خوش بختی ہے کہ اُسے اظہار و بیان کا ایسا نو ایجاد وسیلہ حاصل ہوا،اُسے امرتا اور امروز کی محبت کا کرشمہ کہنا چاہیے۔یہ شعری مجموعہ ملنے سے پہلے میں نے امروز کو خط لکھا تھا۔جو حرف بہ حرف یہاں پیش کر رہا ہوں۔

پیارے امروز!

یہ خط مجھے بہت پہلے لکھنا چاہیے تھا لیکن چاہتے ہوئے بھی نہ لکھ سکا۔پہلے لکھنے کا مطلب ہوتا ایک رسم پوری کرنا، میں امرتا جی کے تعلق میں کچھ بھی ایسا نہیں کرنا چاہتا جو رسما ہو۔دیکھو نہ میں نے ساجد رشید (مدیر نیا ورق) کو بھی فون نہیں کیا۔وہ ضرور مجھے بے مروت سمجھتا ہوگا۔کیا کروں؟ میں نے اپنی زندگی میں تمہارے جیسا مرد کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔میں تمہیں تب سے جانتا ہوں جب تمہارا نام اندر جیت تھا اور تم ماہنامہ شمع کے مستقل آرٹسٹ تھے۔تمہارے اسکیچز کا تاثر لے کر لوگ شمع میں مطبوعہ افسانے پڑھا کرتے تھے۔میں بھی ان میں سے ایک تھا۔انہی دنوں شاید امرتا تمہارے نزدیک ہوئی تھی یا تم ان کے نزدیک آئے تھے۔ان دنوں شاید امرتا جی نے تمہیں امروز کہہ کر پکارا ہوگا۔ان دنوں پاکستان اور ہندوستان کے بے شمار لوگوں کی طرح میں بھی امرتا کے نام سے واقف تھا۔اُن کا لکھا ہوا ناول ڈاکٹر دیو پڑھ چکا تھا لیکن تب میں اُن کی شاعری سے واقف نہیں تھا۔سب سے پہلے ٹیلی ویژن کے ایک مشاعرے میں امرتا جی کو لافانی نظم "اج آکھاں وارث شاہ نوں" سناتے ہوئے دیکھا تھا۔نظم جتنی خوبصورت تھی اُتنی ہی امرتا بھی حسین تھی۔ میں ان دنوں ہندوستان میں تھا۔مجھے اُس دن بہت خوشی ہوئی تھی۔ جب ساجد رشید نے فون کر کے تم دونوں کو اپنے گھر بلایا تاکہ میں امرتا جی سے اور تم سے مل سکوں۔

اس شام تم دونوں سے مل کر مجھے بہت اچھا لگا۔ کھانا کھانے کے بعد میں اور ساجد رشید تم دونوں کو کار میں تمہاری قیام گاہ تک چھوڑنے گئے تھے۔کافی رات بیت چکی تھی۔کار سے نکل کر اُس قیام گاہ کے دروازے تک تم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر بازوؤں کو لہراتے ہوئے گئے تھے۔

وہ منظر آج تک نہیں بھول پایا اور یہ قیمتی لمحات میری یادوں میں ایسے ہی محفوظ ہیں۔امروز! آج جب امرتا جی نہیں رہیں تو میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم کیا سوچتے ہوگے؟ تمہارا وقت کیسے کٹتا ہوگا؟ میں جاننا چاہتا ہوں تمہاری پینٹنگز میں وہی توازن، وہی موسیقی موجود ہے یا نہیں؟ تم کیسے اُٹھتے بیٹھتے ہوئے؟

امرتا جی کے کمرے میں جا کر تم کیا کرتے ہوگے؟ میں جب بھی دلی آؤں گا تم سے ضرور ملوں گا۔

تمہارا دستگیر شہزاد

''جام رکھا ہے ابھی'' عفرا قریشی

شکیل امجد صادق/اوکاڑہ

انسان کو زندگی میں نت نئے تجربات اور مشاہدات سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ تجربات اور مشاہدات انسان کی زندگی میں کبھی مثبت اور کبھی منفی تاثرات مرتب کرتے ہیں۔ منفی تاثرات مایوسی اور یاسیت پیدا کرتے ہیں اور مثبت تاثرات زندگی کے لیے نئے ابواب وا کرتے ہیں۔ ارتقائی منازل سے لے کر عدم کی طرف کوچ کرنے تک انسان کو اس صورت حال سے نبھاہ بھی کرنا پڑتا ہے اور آنے والی مشکلات سے نبرد آزما بھی ہونا پڑتا ہے۔ یہی عمل زندگی بھی ہے اور زندگی کا حسن بھی۔ محبت ایک ایسا پودا ہے جس کا بیج کونپل نکلنے تک اپنی ننھی سی شاخوں پر اپنے تمام پھول کھلا دیتا ہے اور پھر یہ پھول انسان کی زندگی میں رنگ بھرنا شروع کر دیتے ہیں۔ محبت کا ارتقائی عمل اور انسان کی زندگی کا سفر ایک ہی راستے کے دو مسافر بن جاتے ہیں۔ یہ دونوں مسافر جب کوئی دوسرا راستہ نکالتے ہیں تو وہ راستہ شاعری کہلاتا ہے۔ شاعری دراصل قلبی واردات اور کیفیات کا سچا نام ہے۔ یہی قلبی واردات، محسوسات اور کیفیات جب قلبی صورت اختیار کرتی ہیں تو کیتھارسس کا ایک پہلو جنم لیتا ہے اور یہی پہلو عفرا قریشی کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔

ماضی کے جھروکوں میں نظر دوڑایئے اور ایسا لگتا ہے کہ کسی خاتون کا شاعری کرنا یا شعروادب پر گفتگو کرنا دنیا کا دسواں عجوبہ لگتا تھا۔ مگر وقت نے اب کروٹ بدل لی ہے اور اردو ادب میں خواتین شاعرات نئے امکانات اور رجحانات کے ساتھ اپنی جگہ بناتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ادا جعفری، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، شبنم شکیل، شہناز مزمل، کشور ناہید، بشریٰ اعجاز یہ وہ نام ہیں جنھوں نے الگ سے اپنی شناخت پیدا کی اور اپنی اہمیت کا لوہا منوایا۔ جذبات و احساسات کا لبادہ اوڑھے عفرا قریشی بھی اس کاروان میں شامل ہیں۔ عفرا قریشی نے ''مردانہ وجاہت'' سے کام لیتے ہوئے بڑے رنگ و آہنگ کے ساتھ ''جام رکھا ہے ابھی'' کو منصۂ شہود پر لے کے آئی ہیں۔ عفرا قریشی نے جن موضوعات کو اپنے لفظوں میں سمونے کی کوشش کی ہے ان میں سے نمایاں پہلو آس نراش اور اُمید کا پہلو ہے۔ آس نراش کے اس پہلو کے بارے میں ڈاکٹر فخر الحق نوری یوں رقم طراز ہیں:

''عفرا قریشی کی شاعری ایسے نسائی تجربات سے معمور ہے جو ہماری چشم مشاہدہ کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ ان تجربات میں اُمید و یاس اور آس نراش اور دو لفظوں کے درمیان وقوع ہونے بہت سے پرتاثیر تجربات شامل ہیں۔ بلاشبہ ان تجربات کا بیان بھی بہت دل پذیر اور اثر انگیز پیرائے میں ہوا ہے۔''

ناسٹلجیا اور ماضی پرستی ہماری زندگی کا نمایاں پہلو ہے۔ ہم ماضی کے ان تلخ حقائق کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں اور پھر کہیں کہیں ایسا موسم بھی آتا ہے۔ یہاں اُداسی ڈیرے بھی ڈال لیتی ہے۔ عفرا کے ہاں بھی ایسی صورت حال کا حقہ ھو موجود ہے۔

کیسی رت ہے اب کے سال اُداسی کی
میں نے اوڑھ رکھی شال اُداسی کی
کتنے ساون آئے کتنے بیت گئے
اپنی تھی بس ایک ہی چال اُداسی کی
جب جب میں نے دیپک راگ الاپا ہے
اس نے دی ہے مجھ کو تال اُداسی کی

ہجر اردو شاعری کا اساس اور بنیادی اکائی ہے۔ آپ کسی بھی استاد کا دیوان اُٹھا کر دیکھ لیں آپ کو ہجر کا پہلو ضرور نظر آئے گا۔ میر اور ناصر کاظمی کے ہاں یہ رنگ خواہ دلی کے اُجڑنے سے ہو یا ہجرت کے حوالے سے ہو۔ ایک یقینی اور حقیقی حسن پیدا کرتا ہے۔ محبت اور عشق کا مرحلہ کبھی بھی ہجر کے بغیر طے نہیں ہوتا۔ ہجر ہی محبت کی منزل اور عشق کی مراد ہے۔ یقیناً یہ عمل جاں گسل ہے مگر اصل لذت، لذت ریش جگر ہے۔ عفرا قریشی کے ہاں بھی یہ جذبہ شدت سے پایا جاتا ہے اور وہ اس محبتی جذبے میں کہیں کہیں خود سپردگی کا اعلان کرتی ہوئی بھی نظر آتی ہے۔

آپ کا جب خیال آتا ہے
خواہش بے لگام ہوتی ہے
وہ بڑے گھر کی خوبرو لڑکی
لو تمہاری غلام ہوتی ہے

اپنی قسمت پہ ناز کرنا تم
چاہ نیل مرام ہوتی ہے

عفرا قریشی کے ہاں دکھ، درد، حزن اور ملال کا بھی ایک جذبہ ملتا ہے۔ یہ جذبہ دراصل اس کی ذات کی سچی اکائی اور اس کے خارجی ماحول کا ایک اثر ہے۔ عفرا قریشی نے گو کہ یہ اثر قبول نہیں کیا مگر اس سے فرار کی راہ تلاش کرتے ہوئے ضرور نظر آتی ہے۔ عفرا قریشی دکھ، درد، حزن اور ملال کے اس جذبے کو تخلیق شہر اور پر تاثیر الفاظ کا جامع کچھ اس طرح سے پہناتی ہے۔

رفاقت جاں بلب ہونے لگی ہے
ہماری ہر خوشی کھونے لگی ہے
کسی زنداں کا کوئی در کھلا ہے
کوئی فریاد پھر ہونے لگی ہے

کس جنم کی یہ سزا مجھ کو ملی
زندگی پھر بے ردا مجھ کو ملی
آخر شب درد کی لہروں کے بیچ
اپنی ہستی جابجا ملی مجھ کو
جاں گسل ان خواہشوں کے درمیاں
زندگی سیماب پا ملی مجھ کو

غزل کی صنف کے ساتھ ساتھ عفرا قریشی نے اصناف نظم میں بھی طبع آزمائی کی۔ جدت، روانی، سلاست کے ساتھ ساتھ عفرا قریشی کی نظموں میں زندگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ رواں دواں نظر آتی ہے۔ ایک بات جو زیر مطالعہ مجھے عفرا قریشی کے ہاں نظر آئی کہ عفرا نے غزل کی نسبت نظموں میں اپنے اظہار کو کھل کر بیان کیا ہے۔ یوں بھی غزل کی پابندگی شاعر کو آڑے ہاتھوں لیتی ہے۔ آپ ان کی ایک نظم ''اظہار'' دیکھیں:

ہماری آرزوئیں
بے یقینی کی قبا تھامے
ہماری سانس کے دھجے
سروں پر رقص کرتی ہیں
بدن کے زاویوں میں
پھیلتی ہیں
پھر سکڑتی ہیں
ہماری سب تمنائیں
قلم کی نوک میں پنہاں
ہماری خواہشیں ساری
جو بھی ہیں پس زنداں
ہم اس زنداں کے سنگیں قفل
کیسے کھول پائیں گے؟
ہمیشہ چپ رہیں گے؟
یا کبھی ہم بول پائیں گے؟

اُردو ادب میں دوسری مختلف تحریکوں اور تجربات کے ساتھ ساتھ کلاسیکیت اور رومانویت کی تحریک بھی زیر بحث رہی ہے۔ بیسویں صدی کا اردو ادب اُٹھا کر دیکھیں تو ہمیں رومانویت کا یہ جذبہ خوبصورت انداز میں ملتا ہے اور ہماری خواتین شاعرہ بھی اس زمرے میں آتی ہیں۔ عفرا کے ہاں بھی یہ جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:

ذرا سنو!
تم سچ مچ اچھے لڑکے ہو؟
یا مجھ کو اچھے لگتے ہو
پورن ماشی کی راتیں تھیں
جب روپ سروپ کی باتیں تھیں
کبھی چھاؤں دھوپ کی باتیں تھیں
تم بالوں کو سہلاتے تھے
آنکھوں سے باتیں کرتے تھے
تم کبھی بھی یہ نہ جان سکے
ہم کیسے جان چھڑکتے تھے
میرے ارمانوں کی لالی
میرے گالوں پہ چمکتی تھی
جب تیری خوشبو میں کھو کر
میں خود سے باتیں کرتی تھی
اور ساری دنیا سے چھپ کر
دو نین کنول یوں ملتے تھے
میں بار بار مسکاتی تھی
تم کہتے کہتے ہنستے تھے
پر کبھی بھی یہ نہ جان سکے
تم کتنے اچھے لگتے تھے

میری سہیلی، تنہائی، تاخیر، غریب شہر، شام غریباں، تنہا بارش، بند گلی، آنکھ میں سپنا، خواہش، خود کلامی، برگد، تجدید وفا، امکانات اور داستان عشق ایسی نظمیں ہیں جو زندگی کی خوبصورتی، حسن اور دل فریبی کو خوبصورت پیرہن بخشتی ہیں۔ دعائے دل ہے کہ عفرا قریشی کی شاعری وقت گزرنے کے ساتھ مزید فکری وفنی بالیدگی اور پختگی حاصل کرتی چلی جائے۔

تحقیق یا تفتیش

عطاء الحق قاسمی/ لاہور

ادب میں تحقیقی نوعیت کے کاموں پر کبھی ہمارا یقین مستحکم اور کبھی متزلزل ہو جاتا ہے، یقین مستحکم تو ڈاکٹر وحید قریشی، مشفق خواجہ اور اس طرح کے کچھ دور سے تخلیقی محققوں کے گرانقدر کارناموں سے ہوتا ہے اور متزلزل اس صورت میں جب ہم کچھ محققین کو کچھ اس طرح کے موضوعات پر عرق ریزی کرتے دیکھتے ہیں کہ غالبؔ کی پھوپھی صاحبہ کا کیا نام تھا اور میرؔ نے جس ''عطار کے لونڈے'' کا ذکر کیا ہے اس کے دیگر مشاغل کیا تھے۔ اس طرح کے محققین اپنی کاوشوں کے نتائج سے خاصے مطمئن نظر آتے ہیں بالکل اس سردار جی کی طرح جو چائے میں چمچ ہلاتے تھے۔ چائے چکھتے تھے برا سا منہ بناتے تھے اور پھر چائے میں چمچ ہلانا شروع کر دیتے تھے جب وہ یہ عمل تین چار دفعہ دہرا چکے تو انہوں نے چمچ ایک طرف رکھا اور کہا ''لو بھئی سجنو، آج ایک بات ثابت ہو گئی ہے اور وہ یہ کہ اگر چائے میں چینی نہ ڈالی ہو تو لاکھ چمچ ہلائیں میٹھا نہیں ہوتا!''

بس محققین کی بھی وہ کلاس ہے جس سے ہم الرجک ہیں، یعنی یہ لوگ چائے میں چینی ڈالتے نہیں اور چمچ ہلاتے رہتے ہیں۔ ایک دفعہ ہم نے ایک محقق کو دیکھا کہ وہ بہت ایکسا ئیٹڈ ہے اس کے ہاتھ میں کرم خوردہ کاغذوں کا ایک پلندہ ہے جسے وہ سینے سے لگائے ہوئے ہے ہم نے اسے اتنا خوش دیکھا تو پوچھا عزیزم معاملہ کیا ہے اتنے خوش کیوں نظر آ رہے ہو؟'' بولا ''مجھے سو سال پرانے ایک شاعر کا قلمی دیوان ملا ہے ہماری ادب کی پوری تاریخ میں اس شاعر کا کہیں ذکر نہیں۔ میں اس پر مقالہ لکھ رہا ہوں تم دیکھنا دھوم مچیں گی!'' اس محقق نے چیدہ چیدہ شعروں پر پنسل سے نشان بھی لگائے ہوئے تھے ہم نے یہ قلمی دیوان اس سے لیا اور نشان زدہ شعر پڑھنے شروع کئے تو ہم اس نتیجے پر پہنچے اگر کسی نے سو سال تک اس شاعر کی خبر نہیں لی تو ٹھیک ہی نہیں لی۔ بہر حال ہم نے یہ مسودہ اپنے محقق دوست کو واپس کیا اور کہا ''پیارے! اس مسودے کے ذریعے جو خوبی قسمت سے تمہارے ہاتھ لگا ہے۔ تم یقیناً تحقیق کی دنیا میں اپنے جھنڈے گاڑ دو گے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس طرح کے علمی کارنامے تمہاری آئندہ نسلیں بھی انجام دیں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تمہارے محلے میں جتنے پھٹیچر شاعر ہیں ان کے مسودے آٹھ آنے سیر کے حساب سے حاصل کر کے انہیں لاکر میں رکھوا دو اور وصیت لکھوا دو کہ تمہاری وفات کے سو سال بعد یہ لاکر کھولا جائے۔ چنانچہ سو سال بعد جب تمہارے خاندان کا کوئی ہونہار سپوت ان نادر شعری مجموعوں کو منصۂ شہود پر لائے گا جو ناقدریٔ زمانہ کی وجہ سے قبولِ عوام حاصل نہ کر سکے تو ادبی دنیا میں اس کی تحقیق کی دھوم مچ جائیں گی۔ بلکہ میری مانو تو ایک کام اور بھی کر لو۔ ان مسودوں پر ان شاعروں کی تاریخ پیدائش غلط لکھ دو اور اس کے ساتھ ساتھ ایک علیحدہ کاغذ پر ان کی صحیح تاریخ پیدائش بھی ان کے اپنے قلم سے لکھوا لو۔ اس سے فائدہ یہ ہو گا کہ تمہاری نسل کا ایک ہونہار سپوت ان کا شعری کارنامہ منظرِ عام پر لاکر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لے گا اور کوئی دوسرا سپوت ان کی اصل تاریخ پیدائش کے راز سے پردہ اُٹھا کر تحقیق کا لوہا منوائے گا''۔

ہمارے اس محقق دوست کو ہمارا یہ مشورہ بھلا لگا۔ مگر اس نے کہا ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن تاریخ پیدائش کا جھگڑا اقبالؔ جیسے بڑے شاعر کے سلسلے میں تو سمجھ میں آتا ہے ان پھٹیچر شاعروں کی تاریخ پیدائش کے بارے میں کسے دلچسپی ہو گی؟'' یہ سن کر ہم ہنسے اور کہا ''ہدایت اللہ، تم ترقی نہیں کر سکو گے یار تمہارے خاندان کے کسی ہونہار سپوت نے ان شاعروں کو کوئی چھوٹا شاعر کہہ کر تو لوگوں کے سامنے پیش نہیں کرنا، وہ تو انہیں اسی طرح پیش کرے گا جس طرح تم اس کرم خوردہ شاعر کو ایک نادرِ روزگار شاعر کے طور پر پیش کرنے جا رہے ہو، اگر تم اس چکر میں کامیاب رہے تو پھر کامیابی پشت در پشت تمہارے قدم چومے گی''۔

خیر چھوڑیں اس تذکرے کو، لیکن چھوڑیں کیسے ابھی ہم نے اپنی بات تو مکمل نہیں کی اور بات صرف اتنی ہے کہ تحقیق اور تفتیش میں کچھ فرق ہونا چاہیے کیونکہ تحقیق کا تو کچھ نتیجہ ہم نے نکلتے دیکھا ہے جبکہ تفتیش وہ چیز ہے جس کے متعلق ہم ہمیشہ یہی پڑھتے ہیں کہ یہ ''جاری ہے''۔ ایک صاحب نے مچھروں کے بارے میں ''تفتیش'' کا سلسلہ شروع کیا۔ انہوں نے ایک مچھر کو مرتبان میں بند کیا اور اُسے حکم دیا ''اُڑو'' چنانچہ مچھر اُڑتا رہا اس کے بعد انہوں نے مچھر کو مرتبان سے نکالا اور اس کے پر توڑ کر دوبارہ مرتبان میں ڈال دیا اور کہا ''اُڑو'' ظاہر ہے مچھر اب کیسے اڑ سکتا تھا، سو انہوں نے اپنی اس ''تفتیش'' سے نتیجہ یہ نکالا کہ ''اگر مچھر کے پر توڑ دیئے جائیں تو وہ بہرہ ہو جاتا ہے اور پھر حکم نہیں سنتا!'' جو تحقیق ہم پڑھتے ہیں، ان میں سے بیشتر کے نتائج بھی کچھ کچھ اس ''تفتیش'' سے ملتے جلتے ہوتے ہیں اور سچ پوچھیں تو ہمیں اسی پر تشویش ہے۔

طنز و مزاح

بیوی کیا ہے؟

احمد سعید/ پرنگال

بیوی ایک انتہائی خطرناک شئے ہے۔ غصے میں اس کے ہاتھ جو بھی شے لگے وہ اپنے شوہر کے منہ پہ دے مارتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کو کوئی شے نہیں سمجھتی ۔ بلکہ وہ اسے سمجھتی ہی کچھ نہیں۔ وہ اس کے ساتھ زیادہ فری نہیں ہوتی۔ اس نے اپنے آپ کو فری ہینڈ دیا ہوتا ہے۔ وہ جب چاہے جیسے چاہے اپنا ہینڈ گھما کر شوہر کے منہ پہ رسید کر سکتی ہے۔ وہ اس میدان میں بے باک کھلاڑی ہوتی ہے۔ وہ سب کے سامنے اچھی بن سکتی ہے سوائے اپنے شوہر کے۔ اس کو تو وہ منہ بنا بنا دکھاتی ہے بلکہ منہ چڑھا چڑھا کر۔ درحقیقت وہ اسے منہ ہی نہیں لگاتی ۔ اور شوہر اس کے ان افعال پر بھی آگے سے دندیاں (دانت) نکال کر دکھاتا ہے کہ بیگم جی آپ کس قدر خوبصورت منہ بنا لیتی ہیں۔

خیر اب ایسا بھی نہیں کہ وہ زندگی میں کبھی آپ کی عزت کرتی ہی نہ ہو۔ جیون کے سفر میں دو دن اس نے آپ کی بھرپور عزت کی ہوتی ہے اور باقی زندگی بھرپور "عزت کھاتی"...... شادی اور ولیمے والے دن وہ آپ کی اچھی خاصی عزت کرتی ہے (چاہے آپ اس کے قابل ہوں نہ ہوں)۔ ویسے ولیمے والے دن مختلف رائے پائی جاتی ہیں کہ وہ اندر سے عزت نہیں کرتی فقط دکھاوا کرتی ہے۔

ماہرین کہتے ہیں کہ بیوی کی بیرونی کیفیت سے اس کی اصل کیفیت کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے۔ میں (ماہر صنفِ نازک) کہتا ہوں کہ بیوی کی اندرونی کیفیت جان کر بھی اصل کیفیت کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے۔

بیگم آپ کے تمام دوستوں کے خلاف ہوتی ہے سوائے اس کے جو آپ کا بچپن کا دوست تھا اور آپ کو اس کا پتہ بھی نہیں پتہ کہ اب کہاں ہے؟ یعنی برسوں ہوئے اس سے ملے۔ اگر بھولے سے اس کے ساتھ بیتا کوئی قصہ بیگم کے گوش گزار فرمایا تو قصہ شروع ہونے سے پہلے ہی وہ ختم کر دیں گی یہ کہہ کر کہ یہ قصہ اور کتنی بار سنانا ہے؟ آپ محترمہ بیگم صاحبہ کے پیچھے پیچھے وضاحت کرتے پھریں گے کہ یہ قصہ اور ہے وہ اور تھا۔ بس تو لو پہلے۔ وہ فرمائیں گی، تم نام تو اسی دوست کا لے رہے ہو۔ اب انہیں میاں صاحب کیسے سمجھائیں کہ دوست کے ایک ہونے سے قصے کا ایک ہونا کہاں سے لازم ہے؟ بھئی ایک دوست کے ساتھ سینکڑوں قصے ہو سکتے ہیں۔

وہ زمانے اور تھے اب کہ زمانہ اور ہے
غم کی جو آندھی چلی قصہ پرانا اور ہے

لیکن بیوی کی کہی ہوئی بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے، اور شوہر لکیر کا فقیر۔ اس لکیر کو مٹانے کی بجائے نیا پتھر لے آئیں، اور پھر وہ اس پتھر پہ لکیر کی جگہ لکیریں مارے یا آپ کے ہی دے مارے یہ وہ ہی جانتی ہے۔ اور مار کر کہے: ،،کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو،، کیونکہ وہ خود اس کام پہ معمور ہے تو کسی اور کو کیوں اجازت دے۔

بیوی کی سہیلیاں تو چونکے شوہر کی سالیاں ہوتی ہیں تو ان کے بارے میں شوہر کی کیا جرأت کہ کچھ کہے، ویسے بھی شادی کے بعد شوہر کی ٹوٹل (مکمل) جرأت ختم ہو جاتی ہے۔ فقط سہیلیوں پر ہی کیا منحصر، وہ بیوی کے خاندان میں سے کسی کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اور کسی کے بارے میں غلطی سے کوئی لفظ نکل بھی گیا تو وہ پورا ہفتہ آپکے خاندان کے ایک ایک فرد کا نام لے کر اس کو وہ وہ الفاظ سے نوازا جائیگا کہ آپ آپے سے باہر ہو جائیں گے، اور اس شدید غصے کا اظہار آپ اپنے منہ پہ اپنے ہی ہاتھوں دو چار تھپڑ رسید کر کریں گے۔ بقول میرے (میرے سے مراد میں خود ہوں)

شادی وی ہن کر کر لاں گے
جی لاں گے کجھ مر مر لاں گے
اُہدے تے جے غصہ آیا
اپنے ای منہ تے دھر دھر لاں گے

بیوی آپ کی کسی بھی بات پہ کسی بھی لمحے خوش ہو سکتی ہے۔ اور وہ لمحہ آپ کے لئے لمحہ فکریہ ہونا چاہیے، کیونکہ اس بات پہ آپ کو شک بھی نہیں گزرہ ہوتا کہ وہ اس بات پہ خوش بھی ہو سکتی ہے، اور اس پہ طرّہ یہ کہ جس بات پہ وہ آج خوش ہوتی ہے اگلے دن اسی بات پر ناراض بھی ہو سکتی ہے۔ بقول خالد مسعود خاں:

بیوی ایسا گورکھ دھندہ ہے جو پلے پڑ نہیں سکتا
کل جس بات پہ خوش تھی آج وہ اوسے گل پر لڑ سکتی ہے
زوجہ ماجدہ وہ جاسوس ہے جو دو منٹ کے اندر اندر
دل کی ستویں تہہ کے اندر بیٹھی گل کو پھڑ سکتی ہے

روںے کے لیے چاہیے کاندھا مرے دوست

محمود ظفر اقبال ہاشمی/سعودی عرب

شام کا زہر نیلی ٹہنیوں میں اتر چکا تھا۔ تھکے ہارے طیور اپنے اپنے آشیانے میں بیٹھے اپنے نوزائیدہ بچوں کو دن بھر کی رُوداد سنا رہے تھے اور فضا میں ان کی اس گفتگو کا شور پھیلتے ہوئے مضمحل اندھیرے کا بیک گراؤنڈ میوزک محسوس ہوتا تھا۔ گرلز ہاسٹل کے سامنے گھنے درختوں کی قطار کے پیچھے جگنو لمبی گھاس کے اُوپر سر شام اپنی آدھی روشنی ڈھونڈنے نکل آئے تھے۔ چونکہ سرما کے عروج میں راہ گیر سر شام ہی سڑک کو تنہا چھوڑ جاتے ہیں چنانچہ گرلز ہاسٹل اور درختوں کے عین درمیان گہری سوچ میں گم خالی اور اداس سڑک تھی اور کسی ولین کی طرح قہقہے لگاتا ہوا اندھیرا منظروں اور ان کے اصل رنگوں کو فتح کرتا چلا جا رہا تھا!

اِدھر سے وہ نکلی اور اُدھر سے وہ چلا آرہا تھا۔۔۔سڑک کو اپنی تنہائی مٹنے کی وجہ بنتی نظر آئی تو خوشی سے کھل اٹھی!

وہ دونوں ہاتھ اپنی بغلوں میں چھپائے جونہی سڑک پر آئی، جیسے اس کے زخم کا منہ پھر سے کھل گیا اور آنسو قطار در قطار اس کی آنکھوں سے نکل کر سڑک کے کاندھوں پر جذب ہونے لگے۔ ملگجا سا اندھیرا تھا اور سامنے سے وہ اپنی دُھن میں چلا آرہا تھا۔ نئی نئی محبتوں کی سرشاری میں مست! اُسے اس راستے سے نہیں آنا تھا مگر یونہی بلا سوچے سمجھے اس راستے کو شارٹ کٹ سمجھتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ پتلون کی جیبوں میں دبائے اس طرف نکل آیا تھا۔ اس سڑک کے اختتام پر عین سامنے بس سٹاپ تھا جہاں اسے اپنی بس پکڑنا تھی!

وہ اس پیاری سی لڑکی سے ابھی کچھ ہی دُور تھا کہ ہلکے ہلکے اندھیرے میں ایک ہلکورے کی آواز نے پل بھر کے لئے اس کا رابطہ اپنے رنگین خیالات سے منقطع کر دیا۔ اس نے سامنے سے اپنی طرف آتی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا جو پھوٹ پھوٹ کر روئے چلی جا رہی تھی۔ ہلکے ہلکے اندھیرے میں آنسو اس کے بھیگے ہوئے عارض پر جگنوؤں کی طرح چمک رہے تھے اور پھر چند لمحوں بعد جب وہ اس کے پاس سے گذرا تو اپنے کسی دکھ سے لڑتی ہوئی اس لڑکی کو شاید اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ ایک اجنبی اس کے پاس سے گذرتے ہوئے اسے کتنی حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک بہت خوبصورت اور اُجلی رنگت والی لڑکی تھی مگر کسی دکھ کی نیلاہٹ نے اس کی خوبصورتی کو گہنا دیا تھا!

'اتنی پیاری سی لڑکی۔۔۔۔تنہا سڑک پر۔۔۔۔آخر کیوں اس طرح روئے چلی جا رہی ہے؟'

آنسو، روتے اور دُکھوں سے لڑتے ہوئے لوگ ہمیشہ اسے مضطرب کر دیا کرتے تھے!

اس نے مڑ کر دیکھا اور اپنی مخالف سمت پر جاتی ہوئی اس لڑکی کے متعلق متفکر انداز میں سوچا مگر وہ دنیا مافیہا سے بے خبر بار بار اپنے بازو سے آنسو پونچھتے ہوئے اب مخالف سمت میں چلی جا رہی تھی!

وہ کچھ چلا، پھر مڑا اور اسے پھر دیکھا!

اب وہ نسبتاً گہرے اندھیرے میں ملفوف ایک کانپتا اور بھیگا ہوا سا وجود لگ رہی تھی۔ وہ کچھ قدم اور بس سٹاپ کی طرف چلا، پھر مڑ کر اسے دیکھا۔ اب وہ مڑ کر پھر واپس آرہی تھی، نظریں سڑک پر گاڑے بدستور اپنے آنسوؤں سے مات کھا رہی تھی!

چند قدموں کے فاصلے پر گرلز ہاسٹل کی سڑک ختم ہونے والی تھی اور پھر بڑی سڑک پار کر کے وہ اپنے بس سٹاپ پر جا پہنچتا۔ بس اسے وہیں تک جانا تھا مگر اس کے قدم جیسے سلب ہو گئے تھے اور چند قدموں کی مسافت کو اس ایک سوال نے اس قدر طوالت دے ڈالی تھی کہ سامنے چند قدموں کے فاصلے پر واقع بس سٹاپ اسے دنیا کا دوسرا کونا لگنے لگا تھا!

وہ وہیں رک گیا اور اس نے ایک بار پھر مڑ کر اس دل گرفتہ لڑکی کی طرف دیکھا!

دفعتاً اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ اس کے پاس جائے اور اس سے پوچھے کہ ایسا کون سا دکھ ہے جو اس کی خوبصورت آنکھوں سے رِس رِس کر چلا جا رہا ہے مگر اگلے ہی لمحے اسے لگا جیسے نہ تو وہ اس تک پہنچ سکتا تھا اور نہ ہی اس سے کچھ پوچھ سکتا تھا۔ چند قدموں کے فاصلے کے باوجود ان دونوں کے درمیان ان گنت دیواریں حائل تھیں!

اجنبیت کی دیوار!

مخالف اصناف کی دیوار!

اخلاقیات کی دیوار!

جھجک کی دیوار!

اندھیرے کی دیوار!

ڈر کی دیوار!

اسے لگا کہ وہ اتنی ساری دیواریں نہیں گرا سکتا سو بوجھل قدموں کے ساتھ سڑک پار کر کے اپنے بس سٹاپ پر جا کھڑا ہوا اور سامنے ٹہلتی ہوئی اس آزردہ لڑکی کو دیکھنے لگا، اس کی بس آئی اور چلی گئی مگر وہ وہیں پریشان کھڑا اس لڑکی کو دیکھتا رہا۔ وہ دُور سے اس لڑکی کو لاکھوں دلاسے سوچوں کے ذریعے پہنچانے لگا!

'رومت پیاری لڑکی!.....دُکھ زیادہ ہونے لگیں تو سُکھ کہیں پاس ہی ہوتے ہیں مگر آنسوؤں کے شور میں ہمیں دکھائی نہیں دیتے.....اور جب کھڑکیاں دھندلانے لگتی ہیں تو کمرے کے اندر روشنی کی ضرورت اچانک بڑھ جاتی ہے!'

'رومت پیاری لڑکی!.....حوصلے پازیب کی طرح ہوتے ہیں.....اُداسی میں بھی بالکل اسی طرح خوبصورت لگتے ہیں جیسے سرما کی کسی رات کے پچھلے پہر ہوا جو چلمنوں سے ٹکرا کر ایک خوبصورت دھن تخلیق کرتی ہے.....آنسو آسیب کی طرح ہوتے ہیں، اداسی میں بھی اتنے ہی مہیب لگتے ہیں جیسے کسی اُجڑے ہوئے مکاں میں کوئی فسوں زدہ چراغ تھرتھراتا ہے!

'پلیز چپ ہو جاؤ پیاری لڑکی.....کچھ آنکھیں بھیگنے کے لئے نہیں ہوتیں.....کچھ بلکورے سن کر کڑی دھوپ میں بھی آسمان کی رنگت قرمزی سی ہونے لگتی ہے.....اس روز چاند بھی نہیں نکلتا.....کچھ رخسار بھیگنے کے لئے نہیں ہوتے اور اگر بھیگ جائیں تو برساتیں زمین کا رخ نہیں کرتیں.....راتیں بھی بھیگنے سے گھبراتی ہیں!'

'پیاری لڑکی.....اگر میری بات نہیں سمجھتیں تو وہ دیوار سے لگی چنبیلی کی طرف دیکھو.....وہ زرد ہو چلی ہے!.....جب چنبیلی زرد ہونے لگتی ہے تو یہ دستک بہار ہوتی ہے.....یہ زندگی ہے، یہ اسی طرح چلتی ہے.....جب کوئی خلش کا جل کو بار بار پھیلانے لگے تو سمجھ لو کہ کہیں پاس ہی قرار ہے!'

جب دلاسے ختم ہو گئے تو ان کی جگہ دعاؤں نے لے لی!

'اے نیلی چادر کے خالق!.....اپنی اتنی خوبصورت تخلیق کا دکھ سن!.....تُو تو کسی کو اس کی برداشت سے بڑھ کے کوئی تکلیف نہیں دیتا.....اس کے لئے کہیں سے کوئی کاندھا یا پھر کوئی مرہم بھیج میرے خدا!'

مگر کچھ بھی نہ ہوا اور وہ لڑکی اسی طرح روتے ہوئے ٹہلتی رہی اور اپنا دکھ سڑک پر بچھاتی رہی!

ایک اور بس آئی اور چلی گئی!

اور پھر اس نے ایک فیصلہ کر لیا کہ وہ تمام دیواریں گرا کر اس لڑکی کے پاس جائے گا، کسی بندش، ردِ عمل اور نتیجے کی پرواہ کئے بغیر اس سے کہے گا.....

'اپنا دکھ مجھے دے دو.....مَیں دوسروں کے دکھ سنبھالنا خوب جانتا ہوں.....شروع سے مَیں نے یہی کیا ہے.....مَیں جب بھی کسی کا دکھ بانٹتا ہوں میرے اثاثے بڑھ جاتے ہیں!'

یہ سوچ کر اس نے ہمت کرتے ہوئے بے ترتیب دھڑکنوں کے ساتھ اس لڑکی کی طرف اپنا سفر شروع کیا۔ ہر بڑھتے ہوئے قدم پر جیسے جیسے وہ اس کے قریب ہوتی چلی جا رہی تھی اسے اپنا ارادہ بھی مزید مضبوط محسوس ہونے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ اس لڑکی سے کیسے بات شروع کرے گا، اس سے کیا کہے گا اور کس طرح ہمدردی کا مرہم اس کے دُکھ پر رکھے گا!

اور پھر جب اس کا اور لڑکی کا فاصلہ محض چند قدم رہ گیا تو.....!

دفعتاً ہاسٹل سے ایک اور لڑکی باہر نکلی اور اسے دیکھ کر تیزی کے ساتھ روتی ہوئی لڑکی کی طرف آئی۔ اس لڑکی کو اس کی جانب بڑھتے دیکھ کر اس کے بڑھتے قدم وہیں تھم گئے!

اس لڑکی نے روتی ہوئی لڑکی کو محبت کے ساتھ اپنے ساتھ لگایا، اس کے آنسو پونچھے اور اپنے بازو اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے اندر اپنے ساتھ لے گئی۔ جاتے جاتے پشت پر اسے اس لڑکی کی محض چند ہی باتیں سنائی دیں!

'مَیں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا.....پلیز چپ ہو جاؤ.....اتنی پیاری آنکھیں رونے کے لئے نہیں ہوتیں.....مَیں اندازہ کر سکتی ہوں کہ تمہارا دکھ کتنا بڑا ہے مگر میری جان.....دکھ کتنا ہی بڑا اور زخم کتنا ہی گہرا ہو، وہ زندگی سے نہیں جیت سکتا.....دیئے کی لو کو دیکھ لو.....اتنی چھوٹی سی ہوتی ہے مگر سارے جہان کے اندھیرے مل کر بھی اسے شکست نہیں دے سکتے!.....پلیز چپ ہو جاؤ مَیں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی.....!'

اور پھر جب دھیرے دھیرے تشفی دیتی اور معدوم ہوتی وہ آواز اندھیرے میں گھل گئی تو اس نے مسرت اور طمانیت سے بھرپور ایک لمبی سانس بھری، پہلے اوپر آسمانوں کی طرف اور پھر دیوار سے لگی زرد چنبیلی کو دیکھ کر مسکرا دیا!

•

دفعتاً بس کے ہارن نے اسے چونکا دیا.....

اس کی بس آ گئی تھی!!!

احساس کے سکے

پشتون احمد زئی

اپنے علاقے کا کامیاب تاجر تھا۔قرب وجوار میں اُس کی شہرت کا ڈھنکا بجتا تھا۔جس طرح اُس کی تجارت مائل بہ پرواز تھی اور روز بروز ترقی کرتی جارہی تھی اُسکے برعکس اُس کی زندگی کا سورج زوال کی جانب گامزان تھا،آہستہ آہستہ زرد ہوتے ، پہاڑوں کی آغوش میں آیا چاہتا تھا۔لیکن خوشحال خان کو اس کی مطلق پرواہ نہ تھی وہ اسی طرح دن رات کو ایک کئے ہوئے تھا اُس کی نظریں اب ریاست کے گنجان بازاروں پر تھیں وہ اُسے مٹھی میں کرنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔اور ادھر موت آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ اُسکی گردن کی طرف بڑھا رہی تھی۔

خوشحال خان کے دو بیٹے تھے۔تاجے گل اور جمعہ خان۔اور ان دونوں کی ماں آمنہ۔خوشحال خان نے اپنے بیٹوں اور گھر والوں کو سب کچھ دیا تھا،بس صرف وقت نہیں دے پایا تھا۔بڑا بیٹا تاجے گل بالکل اپنے باپ پر گیا تھا پائی پائی کا حساب رکھنے والا اور خوشحال خان کے بقول وہ اسکا شیر بیٹا تھا کیونکہ وہ حساب میں طاق تھا اور چھوٹے جمعہ خان کو وہ نکما اور کام چور کہتا تھا کیونکہ وہ اپنی دنیا میں کھویا رہتا تھا۔کوئی اسے لوٹ کرلے جائے تب بھی اسے چنداں فکر نہ ہوتی تھی وہ بس خلط ملط تصویریں بنا کے،ٹیڑھی ترچھی لکیریں لگا کے اور لمبی لمبی کہانیاں لکھ کے وقت ضائع کرتا تھا اس کا ناقابل معافی جرم یہ تھا کہ وہ پیسوں کو رنڈیوں کا لباس سمجھتا تھا اس کی نظروں میں روپے پیسوں کی قیمت کاغذ یا پتنگ کے کسی ٹکڑے سے بڑھ کر نہ تھی۔

آمنہ کی پہلی اور آخری خواہش کے احترام میں خوشحال صاحب نے ندی کنارے زمین خرید کر ایک عالیشان حویلی کی بنیاد رکھی اور اپنی اور آمنہ کی زندگی کے چراغ میں ختم ہوتے تیل کو سونگھ کر سینکڑوں مزدوروں سے گدھوں جیسا کام لے کر حویلی کا بیج بو دیا ۔اور جلد ہی بیج نے جڑیں پکڑ کر پھلنا پھولنا شروع کر دیا۔

خوشحال خان نے اس دن بڑی مشکل سے دس منٹ قبل ہی دکان بند کرلی دوکان کا تالا لگانے کے بعد اس نے گلی میں دو تین مرتبہ گردن گھما کے نظریں دوڑائیں پر اسے کہیں سے کوئی تاجر پارٹی آتی دکھائی نہ دی۔اس نے آج دس منٹ اپنی حویلی کی زیارت پر قربان کردیئے تھے۔جب وہ حویلی کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کا تئیس سالہ جمعہ خان ہاتھ ہلا ہلا کر مزدوروں سے کام لے رہا ہے اس کی چھاتی پھیلنے لگی چہرے پر ایک ناقابل شکست مسکراہٹ نے جنم لیا اس کے راتوں کی ریاضتیں رنگ لائی تھی اس کا بیٹا اس کا حقیقی جانشین ثابت ہوا تھا۔

نئی حویلی منتقل ہوتے ہی خوشحال خان بستر سے آلگا،بڑے دم درود ہوئے پر افاقہ نہ ہوا موت کی دیوی آہستہ آہستہ خوشحال خان کی سانسوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی اور ایک دن دونوں بیٹوں اور بیوی کی موجودگی میں خوشحال خان نے منہ کھول کے آخری سانس لی اور پھر ہوا اندر ہی رہ گئی اور روح پرواز کر گئی۔

خوشحال حویلی پر ماتم کا پہرہ لگ گیا۔حویلی کی دیواریں بھائیں بھائیں کرتی کاٹنے کو دوڑتی تھیں، ویرانی بانہیں کھولے پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر صحن کے درمیان کھڑی قہقہے لگاتی ،حویلی کے مکین یہ سب دیکھتے اور دیواروں سے لگ کر سسکنے لگتے قدرت کتنی طاقتور اور بے رحم ہے اُن کی آنکھوں سے آنسو چھلکتے ہوئے اُتر جاتے۔

کچھ ہی دنوں میں تاجے گل نے سب کچھ سنبھال لیا۔اُسے معلوم تھا۔کہ قدرت کے ہاں بھی لین دین کا قانون ہے اگر کبھی گھاٹے پہ کوئی رونے بیٹھ جائے تو وہ کل خود کو روئے گا زندگی میں بہت سی نئی راہیں ہیں نئی منڈیاں ہیں جہاں کچھ لگا کے کچھ نہ کچھ ہاتھ آہی جاتا ہے۔لیکن یہ باتیں جمعہ خان کی سمجھ سے باہر تھیں اس نے اپنا والد کھویا تھا۔اور اسے معلوم تھا کہ وہ دنیا جہاں کی دولت لٹا کے بھی صرف ایک لفظ "بیٹا" کی مٹھاس نہیں خرید سکتا پیسوں کے ریل پیل سے وہ مسرت حاصل نہیں ہوسکتی تھی جو بابا کی مسکراہٹ میں بلا معاوضہ حاصل ہو جاتی تھی۔وہ پہلے سفید اور پھر آہستہ آہستہ نیلا پڑنے لگا۔تاجے گل ہر شام رات گئے تک اسکے پاس بیٹھا رہتا اس کا سر دباتا اسے باتیں کرتا اور اس ہنسانے کی کوشش کرتا یہاں تک کہ وہ پھر سے رنگ پکڑنے لگا چہل قدمی کرنے لگا بڑے بھائی کے پیار نے اس کی زندگی میں حرارت بھر دی تھی اور اسکا انجن ہلکا ہلکا چلنے لگا تھا۔لیکن ایک منحوس سی شام تاجے گل نے یہ خبر سنا کر ٹھہرے پانی میں پتھر پھینک دیا کہ وہ دوسرے دن پندرہ دنوں کیلئے افغانستان، ازبکستان اور تاجکستان کے دورے پر جا رہا ہے۔ وہاں وہ اپنے تجارتی مراکز قائم کرکے تجارت کو پھیلانے کا منصوبہ بنا رہا ہے ایک بار پھر حویلی کے چلتے پہیے میں جھول آگیا زندگی پھر عمر رسیدہ کتیا کی مانند زبان

نکالے آہیں بھرنے لگی۔ تاجے گل کی رخصتی کے ایک ہفتہ بعد ہی جمعہ خان کو بیماری نے آن گھیرا اب کی بار بیماری کا شکنجہ کافی مظبوط تھا اور جلدی ہی جمعہ خان کے چہرے کی ہڈیاں نمایاں ہوگئی۔ تاجے گل کو گئے دوسرا مہینہ ہونے کو تھا راتوں کو کافی برف پڑ گئی تھی۔ کمرے کی مدھم روشنی میں جمعہ خان کا زرد چہرہ صاف دکھائی دیتا تھا آمنہ اسکے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی جمعہ خان صبح ہی صبح اپنے بھائی کے پاس چلے جانے کی ضد کر رہا تھا" دیکھ اماں، مجھے نہیں یقین میں اُسکے آنے تک زندہ رہ پاؤنگا یا نہیں اگر میں نے اُن کے آنے سے قبل ہی دم توڑ دیا تو وہ مجھے اس بے وفائی پر کبھی معاف نہیں کرے گا خدارا اماں مجھے اُس کے پاس جانے دیں" اور آمنہ سفید چادر کا دامن منہ میں دبائے روئے جا رہی تھی اس نے ایک ہاتھ سے زور سے سینے میں بے قابو دل کو پکڑ رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ جمعہ خان کے گھنگریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "بیٹا خدا کے لیے ایسا نہ بول، تیری جگہ خدا مجھے اٹھالے تجھے کچھ نہیں ہوگا تیری تو ابھی میں نے شادی کروانی ہے تیرے بیٹے بیٹوں کو گود میں لے کر کھلانا ہے تیرے سے پہلے تو میری باری ہے"

"پھر ماں مجھے اجازت دے تاکہ میرے دل پر بوجھ نہ رہے میں ایک بار ایک بار بھائی سے گلے مل کے آؤں خدا کیلئے" اور ماں نے سسکتے جذبوں کے ساتھ اجازت دے دی۔ نقاہت بھرے وجود کے ساتھ جمعہ خان محبت، پیار اور انسانیت کا علمبردار بن کر اپنے سفید گھوڑے پر گھر سے نکل پڑا، ماں دروازے کے ساتھ کھڑی دور اسے غائب ہوتے دیکھتی رہی۔

تیسرے دن کے دوسرے پہر میں جب جمعہ خان کا سفید عربی گھوڑا آنسو بہاتا آمنہ کے سامنے خالی پیٹھ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا تو آمنہ کو ہوش نہ رہا، جب اسے ہوش آیا تو جمعہ خان کفن میں لپٹا ہوا اس کے سامنے پڑا تھا۔ اس کی نظریں ہجوم میں تاجے گل کو ڈھونڈ رہی تھی پر وہ وہاں موجود نہیں تھا جمعہ خان نے بے وفائی کی تھی وہ اپنے بھائی کو آخری بار گلے سے لگائے بغیر بہت دور چلا گیا تھا۔

گاؤں کے قبرستان میں جمعہ خان کی قبر کے بعد جلد ہی ایک اور قبر کا اضافہ ہو گیا تھا جس کے ماتھے پر "زوجہ خوشحال خان" کی تختی لگی ہوئی تھی۔ اُس دن دوسری بار تاجے گل نے جمعہ خان کی قبر پر پھول چڑھائے تھے۔ اور پھر اس کے بعد خاک سی اُڑ اُڑ کر جمعہ خان کی قبر پر چادر بن کر پھیل جاتی۔ آہستہ آہستہ جمعہ خان کی قبر اپنا وجود کھونے لگی، بارشوں اور پانی کے ریلے نے اس کے مقبرے کے پتھر بکھر دیے تھے۔ جمعہ خان اس خستہ حال قبر میں سے گردن نکالے سویرے سویرے نہ جھکنے والی آنکھوں سے قبرستان کے بیرونی دروازے کو تکتا رہتا، اس کی آنکھوں میں اب بھی امید کے دیے جلتے تھے کہ اسکا بھائی بھی ایک روز آکے اس کی قبر کی بگڑتی حالت کو سنبھالے گا اس کی قبر پر پھول چڑھائے گا اور اس سے ڈھیر ساری باتیں کرے گا۔ اسے ہنسائے گا بچپن کی طرح پھر سے شہزادیوں اور شہزادوں کے قصے سنایا کرے گا، لیکن دن، ہفتے مہینے اور پھر سال گزر گئے پر تاجے گل نہیں آیا، اسکی ماں اسے سمجھاتی "بیٹا اب بس بھی کردے وہ نہیں آئے گا تمہارا بھائی مر چکا جو زندہ ہے وہ ایک تاجر ہے جو کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کر سکتا" پر جمعہ خان کیسے یقین کرتا "جب میں اسے نہیں بھول سکتا تو بھلا وہ مجھے کیسے بھلا سکتا ہے۔ غلطی تو میری ہی تھی میں چھوٹا ہو کر بھی پہل کر دی اور اتنا کمزور پڑ گیا کہ اسے آخری بار مل تک نہیں سکا، دیکھنا ماں وہ ایک دن ضرور آئے گا مجھے ڈانٹے گا مجھے کہے گا "دیکھ یہ اپنے قبر کی کیا حالت بنا رکھی ہے اور پھر وہ میری پختہ قبر بنوائے گا اور مجھے لاکھ باتیں کرے گا دیکھنا ماں، دیکھنا وہ ضرور آئے گا" اور اسکی ماں اسکے بھولپن پر مسکرا اٹھیں" کاش میرا بڑا بیٹا بھی میرے چھوٹے جتنا لائق ہوتا"

آہستہ آہستہ جمعہ خان کی قبر کا نشان تک مٹ گیا پر اب بھی وہ پو پھٹنے سے پہلے ہمیشہ کی طرح قبرستان کی مرکزی گیٹ پر نگاہیں جما دیتا ہے کہ ایک دن اس کی ریاضت ضرور رنگ لائے گی اور آخر کار ایک دن ایسا ہی ہوا، تاجے گل دس بارہ بندوں کے ساتھ چادر اور پھول اٹھائے قبرستان کے مرکزی دروازے سے داخل ہوا، جمعہ خان نے چلا چلا کر ماں کو اٹھایا "ماں میں کہتا تھا میرا بھائی ضرور آئے گا وہ دیکھ آرہا ہے رک رک میں سب کو اٹھاتا ہوں" اور پھر سارے قبرستان والے اس کی قبر میں جمع ہو گئے وہ سب رشک سے جمعہ خان کو دیکھ رہے تھے جمعہ خان پکار پکار کر سب کو بتا رہا تھا" یہ میرا بھائی ہے میرا بھائی، دیکھو کس شان سے چلا آرہا ہے آج مجھ سے ملنے، اب میری بھی قبر پختہ بنے گی دیکھو ارے وہ کتنا قریب آ گیا ہے ہائے میرے بھائی جان " تاجے گل ساتھیوں کے ہمراہ باتیں کرتا ہوا چلا آرہا تھا یہاں تک کہ اس کا پاؤں جمعہ خان کی قبر پر پڑا، خاک سی جمعہ خان اور اسکے ساتھیوں کی آنکھوں میں پڑی "رکئے بھائی یہی میری قبر ہے ارے آپ آگے کہاں جا رہے ہیں ؟" جمعہ خان نے دیکھا کہ تاجے گل اس کی قبر کو روندتا ہوا "پیر روخان" کے مزار کی طرف بڑھ گیا بوسیدہ اور خستہ حال قبر سے قہقہوں کا شور بلند ہوا اور جمعہ خان مر گیا۔

بات تو کچھ بھی نہیں تھی......!

فوزیہ بھٹی/ لاہور

بات تو کچھ بھی نہیں تھی اس کو شاید ایسے ہی چلے جانا تھا ہاں۔۔ شاید۔۔! ایسے ہی چلے جانا تھا۔ مگر کیا پتہ وہ سچ ہی کہتی تھی۔ ہاں۔۔ شاید۔۔! وہ سچ ہی کہتی تھی لیکن ۔۔۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔؟ ہاں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ مگر ایسا ہو بھی تو سکتا ہے ہو سکتا ہے مگر شاید ۔۔ یہ قدرتی عمل ہو۔۔ یقیناً یہ قدرتی عمل ہی ہو سکتا ہے۔ مگر شاید ۔۔! یہ قدرتی عمل نہ بھی ہو۔ شاید اسے الہام ہو جاتا تھا! مگر الہام کیسے ہو سکتا ہے اس بارے۔۔؟ یا پھر، وہ کوئی قبولیت کا لمحہ تھا۔! بھی ہم بہت سی باتیں کہہ جاتے ہیں نا، اور وہ پوری بھی ہو جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے، قدرت نے یا قسمت نے، یا پتہ نہیں کیسے اس کے منہ سے یہ ایک جملہ ادا ہوا اور وہ پورا ہو گیا۔ سچ کہتی تھی کہ اس کی محبت آسیب کی طرح مجھے چمٹ جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔ میں تو خود آسیب ہو گیا ہوں۔ بھلا کتنے برس ہوئے ہوں گے کہ میں نیند کی دوائی کے بغیر سو نہیں سکتا۔ وہ انگلیوں پہ گزرے برس کھوجنے لگا۔ 7 برس۔؟ نہیں نہیں۔ شاید 9۔! دو برس تو میں سوچ نہ پایا تھا ڈھنگ سے اس نے اپنی میز پر پڑی نیند کی گولیوں والی شیشی اٹھائی۔

اب آپ کی دوا بدل رہا ہوں۔ اس سے بہت گہری نیند آئے گی۔ ایک خاص عرصے تک اگر نیند کی دوائیاں استعمال کریں تو یادداشت کھونے لگتی ہے آہستہ آہستہ۔ اور دوائیاں بھی اثر چھوڑ جاتی ہیں۔ کسی بھی صورت ایک سے زیادہ مت کھایئے گا۔ ڈاکٹر نے نسخے پر اپنی اسٹیمپ لگاتے ہوئے اگلے مریض کے لئے گھنٹی بجادی تھی۔

کمال ہے، ڈاکٹر کہتا ہے کہ یادداشت ختم ہو جاتی ہے مگر مجھے تو وہ سب بھی یاد آنے لگا ہے جو کبھی اس کی زندگی میں سوچا ہی نہیں تھا۔ تعجب ہے۔! ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ دوپہر کا کھایا کھانا بھول جاتا ہوں اگر یہ سوچوں کہ اس وقت قمیض کونسی پہنی ہے تو بھی یاد کہاں مجھے آنا ہے دیکھے بغیر۔۔۔ مگر پچھلی باتیں جن پر دھیان نہیں دیتا وہ کیسے یاد رہ گئیں ہیں تعجب ہے دانستہ طور پر اس نے اپنی قمیض کو دیکھا۔ ہاں! ہاں نیلی ہی ہے، مگر نواز کو میں شاید وہ ہلکی گلابی قمیض کا کہا تھا۔۔! بھول گیا ہوگا۔

بے آواز چلتے ٹی وی کو دیکھ کر میں نے ریموٹ ڈھونڈنے کے لئے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اب یہ کہاں رکھ دیا کم بخت نواز نے۔ بس کل اس کو فارغ کردوں گا میں۔ یہ رہا۔ روز نامچے کے نیچے سے ریموٹ نکال کر وہ خود ہی ہنس پڑا۔۔!

ہاں تو میں کہہ رہا تھا، روز نامچے میں آج کا دن قلم بند کرتے ہوئے اس نے پچھلی سطروں پر نگاہ دوڑائی۔

کہ بات تو کچھ بھی نہیں تھی مگر پتہ نہیں اس کو شاید الہام ہو جاتے تھے۔ بھلا سیدھی سادھی گھریلو عورتوں کو بھی الہام ہوتے ہیں۔! چمٹ گئی آسیب کی طرح اس کی محبت مجھے۔ بہت دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے میں نے فریم میں لگی اپنی شادی کی تصویر کو چھوا۔ تھی خوبصورت۔!

عام سے نین نقش والی انور بیگم جب بیاہ کر یہاں آئی تھی تو آتے ہی دو کمروں والے مکان کو گھر میں بدل دیا تھا۔ گھر کے ساتھ ساتھ اس نے رشید اکرم کی یعنی میری زندگی کی ترتیب بھی سنوار دی تھی۔ عام سا رشید اکرم سارے محلے میں ایک دم معزز ہو گیا تھا۔ کلف لگے بے داغ کپڑے پہنے چمڑے کا بیگ تھامے جب میں موٹر سائیکل پر گھر سے نکلتا تو انور بیگم کا سلیقہ دور سے ہی اپنا ڈھنڈورا پیٹنے لگتا۔ سادہ اور خوش باش طبیعت والے رشید اکرم کے کھانے کا ڈبہ جب لنچ ٹائم پر کھلتا تو ہر کوئی اپنا ڈبہ لئے میرے میز پر آن دھمکتا اور مل بانٹ کر کھانے کے کہتے کہتے اس کا سارا کھانا منٹوں میں ختم ہو جاتا۔

ازدواجی زندگی کے بیس سال بس یوں کٹ گئے کہ جیسے انہیں پر لگے ہوں عجیب عورت تھی انور بیگم بھی۔ ماں بنی تب بھی سلیقہ طریقہ ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ اسپتالوں کے چکروں کا سوچ سوچ کر ہولنے والا میں عام سا بندہ ایک دن گھر آیا تو انور بیگم کے پہلو میں گوری سی منی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔!

وہ۔۔ یہ۔۔۔ کیسے؟ کے سوال اس کے منہ پر آتے آتے ہوا ہی ہو گئے۔ یہ آج کل تو اسپتالوں کے بغیر بچہ نہیں ہوتا انور بیگم!!! میں خوش کم اور حیرت زدہ زیادہ تھا۔

ارے ہو جاتے ہیں۔ ہمسائی یخنی گرم کرنے آئی تھی۔ بڑی ہمت والی عورت ہے بھیا تمہاری۔۔! کل سے دردیں لگیں ہوئیں تھیں تم کو بھی نہ بتایا۔ آج بھی گھر کے کام نپٹاتی رہی کہ اسپتال گئے تو کوئی

گھر آ کر یہ نہ کہہ دے کہ کیسا گندا سنڈا گھر چھوڑ گئی تھی۔ اتنے میں وقت ہی نہ رہا۔ یہ دیگیاں چھوڑ کر تو نذیراں دائی رہتی ہے مجھے آواز دی تو میں نے جھٹ بلوالیا۔۔!

ارے اب منہ ہی دیکھتے رہو گے کہ بچی بھی اٹھاؤ گے۔ ہمسائی میرے ہونق بنے منہ کو دیکھتے ہوئے منہ پر دوپٹہ رکھ کر ہنسنے لگی۔

ہاں ۔۔ہاں۔ ! میں نے زرد ہوتی انور بیگم کی شکل سے دیکھتے ہوئے ننھی سی صائمہ کو گود میں اٹھا لیا۔سوائے ان اٹھ دس دنوں کے پھر میں کبھی رشید اکرم نے انور بیگم کو دن کے وقت چار پائی پر پڑے نہ پایا تھا۔

صائمہ کو سولہواں لگا تو انور بیگم نے میرے ہی بھانجے سے اس کو بیاہنے کی ٹھانی۔

ابھی تو چھوٹی ہے۔ ! رشید اکرم نے صائمہ کی کمر تک آتی لمبی چوٹی کو دیکھ کر کہا۔

رشید صاحب۔۔ سولہواں لگ گیا ہے کوئی دن تاریخ لے لیں اب عابدہ باجی سے ۔ ! انور بیگم نے حتمی بات کی مگر یہ سب کیسے ہوگا۔؟ یہ بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی بھلا انور بیگم۔ رشید اکرم ہاتھ میں رکھا نوالہ واپس رکھ چکا تھا۔ کتنی بار کہا ہے کہ روٹی بیچ میں مت چھوڑا کریں ناشکری ہوتی ہے انور بیگم نے بار ہا کہی بات دوہرائی۔

اچھا اچھا۔ رشید اکرم نے جھٹ نوالہ اٹھالیا۔

جتنی ضروری تیاری تھی میں نے کر لی۔ ! تکیوں میں بھرنے والی امریکن روئی کے بادل کمرے سے ملحقہ سٹور میں رکھتے ہوئے وہ عام سے لہجے میں کہنے لگی۔

یوں دو ماہ میں صائمہ اپنے گھر کی ہوئی ۔ آج برسوں بعد رشید اکرم نے اسی تشکر بھری نگاہ سے انور بیگم کو دیکھا تھا۔ جس نگاہ سے صائمہ کی پیدائش پر اس نے دیکھا تھا۔

آج کوئی اپنے دل کی بات ہی کہہ دو مجھ سے۔ پتہ نہیں کیوں رشید اکرم نے انور بیگم کو مخاطب کر لیا تھا۔ آج ہی تو بیٹی وداع ہوئی تھی۔ دونوں ہی اپنی آنکھوں کی نمی ایک دوسرے سے چھپا رہے تھے۔

تم کہہ دو۔! انور بیگم کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

میں بس یہ کہوں گا کہ تم نے میری زندگی کتنی آسان کر دی ہے۔ کس قدر اچھی عورت ہو تم کبھی بھی کسی بھی طرح تم مجھے تنگ نہیں کرتی آج میرا دل چاہتا ہے کہ تم مجھ سے کچھ مانگو۔ میں ساری دنیا لا دینے پر تو قادر نہیں مگر جی چاہتا ہے کہ تم مجھ سے کچھ مانگو۔۔۔!

ایک وعدہ مانگوں گی اور ایک التجا دوہراؤں گی۔ !

انور بیگم ہولے ہولے بولی۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

ہاں ۔ کہو۔۔!

وعدہ یہ کہ تم مجھ سے پہلے نہیں مرو گے۔ کبھی نہیں۔ ! مجھے اکیلے پن سے بڑا خوف آئے گا۔۔!

رشید اکرم ہنس پڑا۔ جھلی ، بے وقوف ! یہ تو رب کے کرنے ہیں وہ مانگ جو میرے اختیار میں ہو۔!

تو تم کس بات کے مجازی خدا ہو۔۔؟

انور بیگم رشید کو دیکھنے لگی۔

اچھا بابا۔۔ ! وعدہ نہیں مروں گا تم سے پہلے۔ !

پکا وعدہ؟ انور بیگم کی آنکھوں میں بے پناہ چمک ابھری تھی۔

اور وہ التجا۔۔؟ رشید اکرم نے انور بیگم سے استفسار کیا۔

یاد ہے نا۔۔! میں تم کو کہتی تھی کہ مجھ سے بھلے جتنے بھی ناراض ہو۔۔! ہمیشہ مجھے معاف کر کے سونا دل میں میل رکھ کر نہ سونا۔

ہاں۔۔ہاں۔۔ یاد ہے۔ تو کبھی ناراض ہونے کا موقع بھی تو دے۔! رشید اکرم ہنستا چلا گیا تھا۔

دیکھو رشید اکرم۔۔! یہ بات یاد رکھنا۔ اگر کبھی موقع آیا اور تم دل میں میل رکھ کر سو گئے نا تو کیا پتہ اگلی صبح ہی نہ ہو میری۔۔! پھر اپنے دل کا میل صاف کرو گے؟ بتاؤ؟ تمہارے بھلے کو ہی کہہ رہی ہوں! لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا ہے تم کو میری باتیں یاد نہیں رہتیں۔! آسیب بن جاؤں گی مر کر تمہارے لئے ۔وہ کھوئی کھوئی آواز میں کہنے لگی۔

اچھا بابا۔! رشید اکرم دل ہی دل میں انور بیگم کے بھولپن پر دیر تک مسکراتا رہا۔

کیوں آئی تھی وہ لڑکر گھر۔۔؟ رشید اکرم انور بیگم سے پوچھنے لگا۔

مارا تھا اسے رزاق نے۔ انور بیگم نے دوسری روٹی سینک کر رشید اکرم کی چنگیر میں رکھی۔

مارا تھا۔۔؟ اور ۔۔تم مجھے اب بتا رہی ہو؟ اتنے آرام۔۔؟ تسلی سے؟ رشید اکرم نے نوالہ سامنے پڑی پلیٹ میں پٹخا۔

روٹی مت چھوڑو۔ ! اسی لئے کہا تھا کہ بعد میں بتاؤں گی۔ انور بیگم کے تسلی سے خشک آٹے کو دوسری چنگیر سے ڈھانپا۔

میں ابھی جاتا ہوں عابدہ باجی کی طرف۔ رشید

اکرم غصے سے اُٹھا۔

غلطی تمہاری اپنی بیٹی کی تھی رشید۔!

انور بیگم چائے کا پانی چڑھانے لگی۔۔۔

کہتی ہے چولہا الگ کرو۔۔!

رشید اکرم کے بڑھتے قدم رک گئے تھے وہ خاموشی سے واپس موڑھے پر بیٹھ گیا۔

میں خود ہی چھوڑ آئی تھی جا کر۔نہیں تو بات بڑھ جاتی ۔ عابدہ نے بھی سمجھایا اور میرے اُسے خود واپس لے جانے پر خوش ہوئی ، چار بہوؤں کا بکھیڑا تھا مگر صائمہ کے لئے کر دیا چولہا الگ۔ اس لئے بات ختم ہوگئی۔

روٹی نہیں کھائی۔ اٹھا لو ، بس چائے دے دو۔۔۔ارشید اکرم بجھ سا گیا تھا۔

انور بیگم نے بڑے غور سے پلیٹ میں پڑے نوالے کو دیکھا اور برتن اٹھا لیے۔

کچھ دن کیلئے بُلا لو اسے یہاں ۔۔ دل بہل جائے گا۔۔! کافی دیر سے گم صم بیٹھے رشید اکرم کے منہ سے آواز آئی۔

دل گھر میں ہی لگا رہے تو بہتر ہے ابھی وہیں رہنے دو میاں بیوی کی صلح ہو جائے تو دو چار دن کو لے آؤں گی۔

موسم بدلنے والا تھا انور بیگم رشید اکرم کے سویٹروں کے ڈھیلے بٹن پکے کر رہی تھی۔

رشید اکرم نے گلے سے بھری ایک نظر انور بیگم پر ڈالی تھی اور چپ چاپ لیٹ گیا تھا۔

انور بیگم نے اگلی صبح کا چہرہ نہ دیکھا تھا چپ چاپ وہ نیند میں ہی دنیا کا دروازہ پار کر گئی تھی۔

نہیں ،نہیں۔۔ وہ کسی ولی یا ولایت کے عہدے پر فائز تھوڑی ہی تھی۔ بس ایسے ہی کہہ دیا ہو گا۔ ہاں اس دوائی میں کافی اثر ہے رشید اکرم کی آنکھیں بند ہو رہی تھی۔ یعنی ہو جاتا ہے کہ کبھی منہ سے نکلی بات پوری ہو جاتی ہے۔ اسے الہام نہیں ہوتے تھے میں جانتا ہوں ۔ رشید اکرم گہری نیند میں بھی یہی بڑ بڑاتا رہا تھا۔میں نے زندگی میں اسے سب کچھ دیا بس یہی ایک بات تھی نا۔تو کوئی بات نہیں ۔ یہ کوئی ایسی التجا تھوڑی ہی تھی ۔ بندہ بشر ہوں فرشتہ تو نہیں آجاتا ہے غصہ تو پھر کیا ہوا۔بات تو کچھ بھی نہیں تھی اس کو شاید ایسے ہی چلے جانا تھا ہاں۔۔ شاید۔! ایسے ہی چلے جانا تھا ۔مگر کیا پتہ وہ سچ ہی کہتی تھی۔ ہاں۔۔شاید۔۔! وہ سچ ہی کہتی تھی لیکن ۔۔۔ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔؟ ہاں۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ مگر ایسا ہو بھی تو سکتا ہے ہوسکتا ہے مگر شاید ۔۔۔یہ قدرتی عمل ہو۔۔یقیناً یہ قدرتی عمل ہی ہوسکتا ہے۔مگر شاید۔۔۔! یہ قدرتی عمل نہ بھی ہو۔ شاید اسے الہام ہو جاتا تھا۔! مگر الہام کیسے ہوسکتا ہے اس بارے۔۔؟ یا پھر، وہ کوئی قبولیت کا لمحہ تھا۔۔۔ویسے بات تو کچھ بھی نہیں تھی۔۔۔۔!

مزاحِ راہ

☆ علی رضا احمد کا شگفتہ و فکاہیہ مضامین پر مشتمل تیسرا مجموعہ

☆ بقول ضیاء الحق قاسمی کہ "علی رضا احمد کے سامنے ایک وسیع میدان پڑا ہے۔ ان کی شائع شدہ تحریریں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے مزاح نگار بن چکے ہیں۔

اعلیٰ امپورٹڈ کاغذ قیمت 300 روپے خوبصورت سرورق سے آراستہ

اُردو تحقیق صورتحال اور تقاضے

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل

پاکستان کے نامور سکالر ڈاکٹر معین الدین عقیل کی اُردو تحقیق کی موجودہ صورت حال اور اسے درپیش مسائل سے آگہی پر عمدہ کتاب، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ اور طالبات کی ضروریات کے لیے انتہائی ممد و معاون

قریباً 5 صد صفحات قیمت: 700 روپے

چولستان تاریخ و ثقافت

چولستان کی تاریخ و ثقافت کے حوالے سے ایک اہم کتاب۔ اس خطے کے حکمرانوں، صوفیاء، اولیاء اللہ، فنکاروں، رسم و رواج، تاریخی عمارتوں سے روشناس کرایا گیا ایک مختصر مگر جامع کتاب۔

پروفیسر جاوید عثمان شامی کے قلم سے۔ قیمت 300 روپے

القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

وطن سے دور

نسیم سکینہ صدف

جمیل کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ ہوتی بھی کیوں نہ وہ تو دنیا کے خوبصورت شہر لندن کے لیے پرواز کرنے والا تھا۔ اس کے تمام دوست اُسے الوداع کہنے کے لیے ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ جمیل اپنے سنہرے خوابوں میں کھویا ہوا تھا۔ جہاز کی تیاری کا اعلان ہوا جمیل نے اپنا سوٹ کیس اُٹھایا۔ دوستوں سے گلے ملا اور ہاتھ ہلاتا ہوا جہاز کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ جمیل ایک دفتر میں معقول تنخواہ پر ملازم تھا لیکن اس کے ذہن میں بس ایک ہی بات تھی اور وہ غیر ممالک جا کر دولت کمانے کی۔ شام کے قریب جہاز لندن ایئرپورٹ پر اُترا اور وہ ٹیکسی کے ذریعے اپنے ہم وطنوں کی ایک رہائش گاہ پر پہنچا جس کا پتہ اسے پہلے ہی مل گیا تھا۔ مالک مکان جو کہ خیر سے اس کا ہم وطن ہی تھا، نے خوب آؤ بھگت کی اور کہا کہ وہ اس کے لیے جلد ہی مکان میں جگہ بنا دے گا۔ مکان کیا تھا ایک فلیٹ تھا جس میں تین چھوٹے چھوٹے کمرے تھے اور ہر کمرہ مشکل سے دو آدمیوں کے لیے کافی تھا۔ مگر یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ ایک کمرہ تقریباً دس آدمیوں کو الاٹ کیا گیا تھا...... ہوا تھا؟

چونکہ جمیل کے لیے کوئی جگہ خالی نہیں اس لیے وہ ایک دوسرے شخص کی جگہ پر لیٹ گیا۔ سفر سے تھکان کی وجہ سے جلد ہی اس کی آنکھ لگ گئی لیکن تھوڑی دیر بعد ہی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اس جگہ کا مالک اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر آ چکا تھا۔ اس نے جمیل کو بازو سے پکڑ کر پرے کیا اور سو رہے جمیل نے ایک دوسری جگہ سونے کی ناکام کوشش کی۔ مگر اس وقت چھٹی کا وقت تھا اور ہر کوئی اپنی ڈیوٹی سے واپس آ گیا تھا۔ لہٰذا چلتے چلتے وہ دروازے تک پہنچ گیا اور ساری رات دروازے ہی میں بیٹھ کر گزاری۔ صبح منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر کے نوکری کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ نوکری تو نہ مل سکی البتہ سڑک میں اپنے ہاتھ نہ چلنے کی وجہ سے چالان کرا بیٹھا اور عدالت نے اسے بیس پونڈ کا جرمانہ کر دیا۔

اس کی رقم آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ مگر اسے ابھی تک نوکری ہی نہیں ملی تھی۔ نوکری اس کے لیے اتنی بے چین بھی نہیں تھی کہ آتے ہی اسے دامن میں سمیٹ لیتی۔ کسی کسی دن اسے تھوڑی سی مزدوری مل جاتی۔ اُدھر مالک مکان الگ وقت کا پابند اور لین دین کا کھرا تھا۔ اس لیے وہ ہفتے بعد میں اپنا کرایہ وصول کر لیتا تھا۔ جمیل کو وطن سے آئے ہوئے تین ماہ ہو گئے اس کی تمام اُمیدیں ختم ہو گئیں لیکن اسے نوکری نہ مل سکی۔ بعض اوقات تو ایسا ہوا کہ لوگوں نے بھکاری سمجھ کر اس کے ہاتھوں پر پیسے تھما دیے۔

اسے اب اپنے دوست کی نصیحتیں یاد آ رہی تھیں۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ آخر چوتھے ماہ کے آخر میں جب بالکل ہی مایوس ہو گیا تو اس نے اپنے دوست امجد کو واپسی کے ٹکٹ اور کچھ رقم بھیجنے کے متعلق لکھا۔ جلد ہی اس کا ٹکٹ بھی آ گیا اور رقم بھی۔

اس رقم سے اس نے اپنے بقایا جات ادا کر لیے اور اپنے ہم وطنوں سے رُخصت ہو کر ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

جہاز فضاؤں کی بلندیوں میں پرواز کر رہا تھا لیکن آج جمیل کا ذہن سنہرے خوابوں میں محو پرواز نہیں تھا۔ اس کا دل جلد از جلد پاک سرزمین پر قدم رکھنے کے لیے بے چین تھا۔ خدا خدا کر کے وہ اپنے ملک میں پہنچا۔ جہاز سے اُترتے ہی وہ پاک وطن کی عظمت میں سجدہ ریز ہو گیا اور وطن کی مٹی کو چوما۔ امجد اسے لینے کے لیے ایئرپورٹ پر موجود تھا۔ جمیل اس سے گلے مل کر خوب خوب رویا اور اپنے کیے پر شرمندگی ظاہر کی۔ یہ تھی ایک دولت کمانے والے اور وطن عزیز کو چھوڑ کر غیر ممالک میں جانے والے ایک نوجوان کی کہانی۔ میرے بہت سے ہم وطن آج کل بہت زیادہ اس وبا میں مبتلا ہیں۔

ان سے التماس ہے کہ وہ جمیل کی ذات سے سبق سیکھیں اور ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دیں جن کی تعبیر بہت مشکل ہے۔ خدا ایسے نوجوانوں کو ہدایت عطا فرمائے۔ آمین

گرم کوٹ

روبنسن سیموئیل گل

بوڑھے باپ کے دل میں ایک ہی خلش تھی کہ وہ اتنی محنت مشقت کرکے بھی عمر بھر اپنے بچوں کو سر چھپانے کے لئے ٹھکانہ نہ دے سکا۔ گاؤں میں اینٹوں کے بھٹے پر اینٹیں بناتے بناتے عمر گزر گئی تھی۔ تین بیٹوں اور دو بیٹیوں کو پالتے پالتے قرض کے جال میں ایسا پھنستا چلا گیا کہ خود سے نکلنا ناممکن ہوگیا۔ اَب تو اُسکا اور اُسکے بچوں کا مقدر عمر بھر بھٹے والوں کی غلامی ہی تھا۔ بھلا ہو بڑے پتر طفیل کا جس نے مزدوری کی تلاش میں لاہور شہر کا رُخ کیا اور رفتہ رفتہ اس قابل ہوگیا کہ دونوں چھوٹوں کو بھی اپنے پاس ہی بلا لیا اور تینوں سلمی ستارہ اور تِلے کڑھائی کا کام کرنے لگے۔ دونوں بہنوں کی بھی شادیاں کیں، وہ اپنے اپنے گھر کی ہوئیں تو لڑکوں نے بھٹے کا قرضہ بھی چند سالوں میں ہی اُتار لیا۔

ڈاکیئے نے منظور کو اُسکے بیٹے کا خط تھمایا تو منظور بولا، ''پتر رشید مجھے خط پڑھ کر بھی سُنا دے۔ تجھے تو پتہ ہے کہ مَیں اَن پڑھ ہوں۔''

ڈاکیئے نے خط کے نیلے لفافے کو ایک جانب سے پھاڑ کر باہر نکالا اور کاغذ کی تہہ کھول کر خط پڑھنے لگا، ''چاچا تیرے پتر طفیل کا خط ہے اُس نے لکھا ہے، اباجی مَیں نے یہاں ذرا کھلا گھر کرائے پر لے لیا ہے آپ اماں جی کو لیکر اِدھر شہر آجائیں۔ اب گاؤں میں کیا رکھا ہے؟ ناصر اور مقصود بھی ٹھیک ہیں اور ہمارا کام سیٹ جا رہا ہے، اس لئے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ وہ دونوں بھی سلام دے رہے ہیں۔ آپ اور اماں جی یہ خط ملتے ہی اگلے روز لاہور آجائیں۔ فی الحال ہم پُرانی والی بیٹھک میں ہی رہ رہے ہیں جہاں آپ تین مہینے پہلے آئے تھے۔ مَیں اپنا موبائل نمبر بھی لکھ کر بھیج رہا ہوں تیرے پتر نے موبائل بھی لے لیا ہے۔ آتے ہوئے اس نمبر پر رابطہ کرنا مَیں ریلوے سٹیشن سے آپ دونوں کو لے لونگا۔ اماں جی کو اور آپکو بہت بہت سلام۔ فقط آپ کا بیٹا، طفیل۔''

''لے چاچا۔ . . یہ خط سنبھال لے اس میں تیرے پتر کا موبئل نمبر لکھا ہے۔ اب تو تُو بھی شہری ہو جائیگا۔ . . وہاں پڑھ بھی لینا، شہر میں تو بوڑھوں کے بھی سکول ہوتے ہیں۔ پھر تجھے یوں خط دوسروں سے نہیں پڑھوانے پڑیں گے۔''

ڈاکیا مسکراتے ہوئے منظور کو خط پکڑا کر وہاں سے چلتا بنا۔

منظور نے خط کو مزید تہہ کیا اور اپنے کُرتے کی جیب میں رکھتے ہوئے بولا، ''مَیں نے اب کہاں شہری بننا ہے مجھے تو شہر پسند ہی نہیں۔ . . شہری تو تب ہونگا، جب شہر جاؤنگا۔''

سچ تو یہ تھا کہ وہ پہلے بھی یہی سوچتا تھا کہ اُس نے اپنے بچوں کو کوئی زمین، مربع حتیٰ کہ چھوٹا سا مکان بھی نہ دیا۔ . . اُنکے لئے کچھ کیا بھی تو بس قرضے کا بوجھ ہی بڑھاتا گیا۔ اب قرضے کا بوجھ تو اُتر چکا تھا مگر اپنی بڑھیا کو ہمراہ لئے وہ لڑکوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔

''پروین او پروین۔ . . ارے سُنتی ہے، تیرے پتر طفیل کا خط آیا، ہم دونوں کو شہر بلایا ہے۔''

پروین اپنے ڈوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی بولی، ''تو چل آ چلیں، یہاں گاؤں میں کیا رکھا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے پروین کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

''ناں تُو چلی جا، مَیں تو گاؤں میں ہی بھلا۔''

''لے تیرے بغیر مَیں کیسے جاؤنگی، تجھے یہاں کلے تھوڑی چھڈنا ہے۔''

''مَیں تو اپنے پتروں پر بوجھ نہ بنوں، یہاں بھٹے پر بڑا کام ہے۔ عزت سے کما رہے ہیں، سکھی ہیں اور عزت سے کھا رہے ہیں۔ . . اور کیا چاہیے؟''

''طفیل کے ابا تُو کیوں سوچتا ہے کہ ہم اپنے لڑکوں کے لئے بوجھ بن جائیں گے؟''

پروین مَیں تو ہمیشہ سوچتا اور پریشان ہوتا ہوں کہ اپنے بچوں کے لئے کچھ کر نہ سکا، نہ اُنہیں چنگی طرح پڑھا لکھا سکا اور نہ ہی کوئی مربع دے سکا، ساری عمر بس یونہی گزر گئی۔''

چل تُو فکر نہ کر، ہمارے ایک نہیں تین تین پتر ہیں، بھلا اُن پر کیوں بوجھ ہونگے وہ تو بلکہ خوش ہونگے کہ اُنکے ماں پیو اُنکے پاس ہیں۔ پتہ نہیں میرے پتر بچارے صحیح طرح سے کھانا بھی کھاتے ہیں یا نہیں ہم وہاں ہونگے تو مَیں اُنہیں اپنے ہاتھ سے کھانے بنا بنا کر کھلایا کرونگی۔

دونوں اپنی اپنی چارپائیوں پر آمنے سامنے بیٹھے گفتگو میں مصروف تھے۔

منظور ہنستے ہوئے بولا،

''چل شہر بھی چلے جائیں گے، اپنے پتروں کو

اپنے ہاتھ سے کھانا کھلا دینا مگر ابھی میرے لئے تو کھانا لے آ، بڑی بھوک لگی ہے۔"

"اوہو باتیں کرتے کرتے میں بھول ہی گئی میں نے ناں تیرے لئے آج خاص اپنے ہاتھ سے ساگ بنایا، تُو ہتھ منہ دھوئے میں تیرے لئے مکئی کی تازہ روٹی بناتی ہوں۔"

ساگ اور مکئی کی روٹی کا سن کر منظور کی بھوک اور بھی زیادہ چمک گئی۔

منظور اب بھی بھٹے پر کام کرتا تھا مگر دوپہر کا کھانا ہمیشہ گھر آ کر کھاتا تھا کیونکہ پروین کے ہاتھ کے کھانے کے علاوہ اُسے سواد ہی نہیں آتا تھا۔

کھانے کے بعد پروین نے بڑی محبت کے ساتھ ایک لفافہ منظور کو پیش کیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"آپ کھول کے دیکھ لے ناں، میں کیوں بتاؤں؟" منظور نے بڑے تجسس اور دلچسپی کے ساتھ اُس خاکی لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر اُسے ایک جانب سے کھول کر اس شے کو باہر نکال لیا۔

"ہائے میں صدقے جاواں، میرے لئے تو نے ایک اور تحفہ خرید لیا، کیوں خواہ مخواہ پیسے ضائع کرتی رہتی ہے؟"

"ایک تو تجھے ہر شے خواہ مخواہ ہی لگتی رہتی ہے آج کھیسوں دریوں والا آیا تو میں نے بھی تیرے لئے یہ چادر خرید لی۔"

منظور بڑی خوشی کے ساتھ اس کھیس نما چادر کو اپنے اوپر اوڑھ چکا تھا اور اپنی بیوی کو ایسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جس میں محبت، چاہت اور شکر گزاری کا عنصر نمایاں تھا۔

نہ جانے کیسے اگلے ہی روز منظور شہر جانے کی باتیں کرنے لگا منصوبے بنانے لگا۔ سچ تو یہ تھا کہ اب اُسکی عمر نہیں تھی کہ وہ بھٹے پر اپنے پیروں پر بیٹھے سارا سارا دن گیلی مٹی اور گارے کو سانچوں میں ڈال ڈال کر اینٹیں بناتا رہا کرے۔

"پروین تو صحیح کہتی ہے، یہاں گاؤں میں کیا رکھا ہے؟ ..... شہر ہی چلتے ہیں۔ میں چوکیداری کرلونگا، مالی کا کام کرلونگا۔ ان بھٹے والوں سے تو جان چھوٹے گی۔ اُسکا مکان اُسکا کب تھا۔ یہی خلش تو بوڑھے باپ کے دل میں تھی کہ ایک چھوٹی سی ذاتی کٹیا بھی نہ بنا سکا۔ یہ بھی بھٹے والے کی دی ہوئی تھی، بلکہ اُنہوں نے تو زمین کا ٹکڑا ہی اس غرض سے دیا کہ جب تک کام کرتے ہو یہیں رہو۔ منظور نے ٹیڑھی ترچھی اینٹوں، پتھروں اور گارے مٹی سے سر چھپانے کے لئے ٹھکانہ بنا ہی لیا تھا۔ یہیں پانچوں بچوں کی پیدائش اور نشو نما ہوئی تھی۔

شہر میں طفیل، ناصر اور مقصود پہلے ایک بیٹھک لیکر اُس میں رہتے تھے، اب اُنہوں نے دو کمروں والا مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ شہروں میں کرائے بھی کہاں کم تھے اور مکان، مکان تو بہت ہی خستہ حالت۔ مگر مجبوری تھی، کم وسائل کے ساتھ شہر میں رہنا بھی تو آسان نہ تھا۔

وہ دن تینوں بیٹوں کے لئے بڑا خوشگوار تھا جب بوڑھا منظور اور اُسکی بیوی پروین لاہور سٹیشن پر اُترے۔ طفیل کو پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی اور صرف وہی چھٹی لیکر اپنے والدین کو لینے آ سکا۔ باقی دو تو اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔

پانچ لوگوں کے لئے دو کمروں کا مکان انتہائی مناسب تھا۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جب منظور نے سوچا نہ ہو کہ وہ کچھ نہیں کر رہا۔ اُسے بار ہا یہ خیال تنگ کرتا کہ وہ اور اُسکی بیوی اپنے لڑکوں پر بوجھ بنے ہوئے ہیں۔ لڑکے بھی ایسا ہرگز محسوس نہیں کرتے تھے جب تک کہ طفیل کی شادی نہ ہوگئی۔

اچانک سے وہی انتہائی مناسب دو کمروں والا مکان چھوٹا لگنے لگا۔ اگر کبھی بہنوں میں سے کوئی والدین اور بھائیوں کو ملنے آ جاتی تو بہت ہی زیادہ دقت محسوس ہوتی۔ پھر کچھ عرصے بعد ناصر کا بھی خاندان بنانے کا وقت آ پہنچا اور اُسکی دلہن بھی اُسی گھر میں آ گئی۔ انتہائی سادگی کے ساتھ یہ شادی بھی کی گئی۔

بوڑھا منظور اور پروین تو اب اسی ماحول میں راضی ہو چکے تھے۔ جس کونے میں اُنہیں بٹھا دیا جاتا وہ بیٹھ جاتے۔ منظور بازار سے سودا سلف لے آتا اور کسی نہ کسی طرح ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ تاہم اب بڑے دو لڑکوں اور اُنکی بیویوں کو قدرے بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔ طفیل کی بیوی ویسے بھی اب اُمید سے تھی یعنی اسی دو کمرے والے مکان میں آٹھویں فرد کا اضافہ ہونے والا تھا۔

ایک روز طفیل خوشی خوشی گھر آیا اور اپنے باپ کو مخاطب کر کے بولا "ابا جی، میرے ایک دوست نے بتایا ہے کہ اسلام آباد میں غریب طبقے کے لئے پلاٹ مل رہے ہیں۔ میں نے پانچ سو روپیہ فیس جمع کروا دی ہے۔"

منظور کے چہرے پر یکدم خوشی کے آثار نمایاں ہوگئے۔

"اچھا پتر یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔"

"ہاں ابا جی، اگر پلاٹ کا قبضہ مل جائے تو ہم اپنا ایک چھوٹا سا مکان بنا سکتے ہیں۔ پھر ان کرایوں سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔"

منظور کو یوں محسوس ہوا گویا اُسکے دل میں دہکتے ہوئے کوئلوں پر کسی نے سرد پانی پھینک دیا ہو۔ اُسکی برس ہا برس کی آرزو بر آنے والی تھی۔

''مگر ابا جی، ایک مسئلہ ہے۔ میرے دوست نے کہا ہے کہ قبضہ کے لئے کسی نہ کسی کا وہاں موجود رہنا ضروری ہے۔ اب آپکو تو پتہ ہی ہے کہ میں ناصر اور مقصود یہاں محنت مزدوری میں لگے ہوئے ہیں اور کتنے مصروف ہیں۔ اسلئے اگر آپ وہاں چلے جائیں تو ہم وہ زمین حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔''

منظور نے یکدم اپنے دل میں گھبراہٹ سی محسوس کی مگر دوسرے ہی لمحے بول اٹھا، ''بیٹے تو فکر ہی نہ کر میں ضرور جاؤں گا۔ تو یہ بتا کہ جانا کب ہے؟''

''بس ابا جی، جونہی میرا دوست ریاض مجھے صورتحال سے آگاہ کرتا ہے میں آپکو پنڈی والی ٹرین پر بٹھا دونگا۔''

ایک وہ دن تھا جب منظور اور اُسکی بیوی اپنا بوریا بستر لپیٹے لاہور پہنچے تھے...... ٹرین ہی کے ذریعے، اور اَب ایک یہ دن آ پہنچا تھا جب بوڑھا منظور ٹرین کی اکانومی کلاس میں کھڑکی کی جانب بیٹھا ریل گاڑی کی روانگی کا انتظار کر رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ سفر پروین کے ہمراہ تھا اور اب یہ سفر اُسکے بغیر تھا۔ اس لئے وہ پلیٹ فارم پر کھڑی پُرنم آنکھوں سے اپنے شوہر کو دیکھتی تھی۔ وہ چادر جو اُس نے اُس روز گاؤں سے منظور کے لئے خریدی تھی، اُسکے سفری بیگ میں سب سے اوپر تھی۔

پروین نے کھڑکی کے قریب ہوتے ہوئے منظور سے کہا، ''سنا ہے اسلام آباد میں بڑی ٹھنڈ ہوتی ہے اس لئے وہ چادر بھی دو جوڑوں کے ساتھ ڈال دی ہے۔''

''اوہ اماں جی اسلام آباد میں سردیوں میں سردی ہوگی آجکل تو وہاں بہت اچھا موسم ہوگا۔''

اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے طفیل نے اپنا جملہ مکمل کیا، ''کم ازکم لاہور کی طرح چبھنے والی گرمی اور حبس تو نہ ہوگی۔''

''بس پتر تجھے پتہ ہے نہ کہ تیری ماں کو میری کتنی فکر ہوتی ہے۔'' منظور نے جھریوں زدہ چہرے پر بناوٹی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ سچ یہ تھا کہ اُسے پروین سے جدائی کا بہت ہی زیادہ غم تھا اور یہی حال پروین کا بھی تھا۔

طفیل پھر بولا، ''......اور ہاں ابا تو موبائل سنبھال کر رکھنا اور میں نے ہمراہ چارجر بھی رکھ دیا ہے۔ یاد سے بجلی میں لگا کر چارج کر لیا کرنا۔ میں خود آپ سے رابطہ کرتا رہونگا۔ فکر نہ کرنا بہت جلدی ہمیں قبضہ مل جائیگا۔ سی ڈی اے وہاں نہ بھی دے تو کہیں اور تو ضرور ہی دے دیگا۔ میرے دوست ریاض نے بڑی اُمید دلائی ہے۔''

''اچھا پتر ہم ضرور وہیں مکان بنائیں گے ابھی تیرا ابا جیتا ہے۔ میں کسی صورت قبضہ نہیں چھوڑونگا۔''

ٹرین کے ہارن اور گارڈ کی سیٹی نے اطلاع دی کہ ٹرین روانگی کے لئے بالکل تیار ہے۔ ٹرین حرکت میں آچکی تھی۔ ''اچھا اپنا خیال رکھنا۔''

''تو بھی اپنا خیال رکھنا۔'' پروین نے منظور کی بات سن کر ڈبڈبائی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ٹرین آگے بڑھی تو منظور کا چہرہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ستمبر کا مہینہ تھا اور اسلام آباد میں حالیہ بارشوں کے باعث موسم میں خنکی نمایاں تھی۔ منظور جیسے کئی اور لوگ جو پسماندہ اور پسے ہوئے طبقے سے تعلق رکھتے تھے، پلاٹ کی آس میں کھلے آسمان تلے خیموں میں دن گزار رہے تھے۔

طفیل کے دوست نے بوڑھے منظور کو سٹیشن سے لیا تھا اور اُس مقام تک چھوڑ کر جہاں کسی نام نہاد فلاحی و نیم سیاسی تنظیم نے غریبوں کے ایک بڑے گروہ کو ملک کے دارلخلافہ کے نواحی علاقے میں لا کر بٹھا دیا تھا، نہ جانے خود کہاں غائب ہو گیا تھا۔

خیمے اور اس عارضی رہائش کے لئے منظور کو ایک ہزار روپے ادا کرنے پڑے تھے۔ وہ اپنے ہمراہ لایا ہی کیا تھا۔ چند جوڑے کپڑے، ایک عدد کھیس نما چادر، ایک ہی کھیڑی جو پہن رکھی تھی اور جیب میں مبلغ اڑھائی ہزار روپے۔ . . جس میں سے ایک ہزار تو یک مشت ادا کرنے پڑے۔

اس خیمہ بستی میں منظور اکیلا نہ تھا اُسکی مانند اور بھی بہت تھے، کچھ تو خاندانوں سمیت ڈیرا لگائے بیٹھے تھے اور زیادہ تر بابے تھے جن میں سے چند ایک کی منظور کے ساتھ علیک سلیک ہوگئی تو اُس کا بھی دل لگ گیا۔

منظور کا سب سے اچھا دوست اُسکا ہم عمر رفیق بن گیا۔ جسے وہ 'فیکا' کہہ کر پکارتا تھا۔ دونوں ایک ہی خیمے میں سوتے، دن بھر یونہی گپیں ہانکتے، کبھی ادھر بیٹھتے، کبھی اُدھر بیٹھتے اور کبھی ماضی کی باتیں کرتے کرتے وقت گزار دیتے۔

مہینہ ڈیڑھ مہینہ گزر چکا تھا مگر اب تک سلسلہ آگے نہیں بڑھ پا رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً لیڈران آ کر تسلیاں اور دلاسے دے جاتے تھے مگر عملی طور پر کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔

''یار فیکے، ہمیں تو یہاں بیٹھے کتنا ٹائم لگ گیا

ہے مگر کوئی سر سید ھی نہیں ہو رہی۔"
"بس منظور فکر نہ کر جلد از جلد کچھ ہونے والا ہے۔"
رفیق کی بات سنکر منظور قدرے تسلی پا تا تھا۔
نومبر کا مہینہ شروع ہوا تو اپنے ہمراہ سردی کی شدید لہر بھی لے آیا۔ درختوں کے پتے زرد ہو کر گرتے تھے اور تیز ہوائیں چلتی تھیں۔ درخت ٹنڈ منڈ ہو رہے تھے۔
منظور اپنی میلی سی چادر اپنے گرد لپیٹے گرم گرم چائے کی چسکیاں لگا رہا تھا۔ اُنکے خیمے میں رفیق کے علاوہ دو اور بابے بھی تھے جو اپنے ماضی اور بچوں کی باتیں کر کے محظوظ ہوتے تھے۔ خصوصاً پوتے پوتیوں کی باتوں سے ہر طرف قہقہے بکھر جاتے اور خیمہ میں گویا زندگی نظر آنے لگتی۔
باہر تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ مری کے پہاڑوں پر برفباری نے اسلام آباد کے موسم کو بھی برفیلا بنا دیا تھا۔
یونہی ہر رات گزر جاتی اور ایک ہی کشتی کے سوار یہ دکھی بابے ایک دوسرے کے لئے تسلی، حوصلہ افزائی اور ڈھارس کا باعث بن جاتے۔ سردی اس قدر شدید تھی کہ منظور کی چادر اب کافی نہ رہی تھی۔ وہ چادر اُسے ہمیشہ احساس دلاتی تھی کہ اُسکی پروین.. اُسکی زندگی، اُسکے آس پاس ہے۔ وہ ایک نہیں بلکہ کئی بار رفیق کو یہ کہانی سنا چکا تھا۔
"یار فیکے تیری پرجائی نے میرے لئے چادر خریدی. . اُس دن اُس نے ساگ اور مکئی کی روٹی بھی بنائی تھی۔ وہ ایسا ساگ بناتی ہے کہ سواد آجاتا ہے کسی دن تجھے تیری پرجائی کے ہاتھ کا ساگ کھلاؤنگا۔"

رفیق مسکراتے ہوئے اُسکی اُن ہی باتوں کو بار بار سنکر بھی اُسی طرح محظوظ ہوتا رہتا تھا جیسے پہلی بار سنتے ہوئے محظوظ ہوا تھا۔ دراصل وہ بھی تو اپنی اور اپنے خاندان کی باتیں نہ جانے کتنی بار منظور کو سنا چکا تھا۔ دونوں کے پاس کرنے کو تھا ہی کیا...... سوائے باتوں کے ......اور آخر وہ نئی نئی باتیں کہاں سے لاتے؟ اس خیمہ بستی میں سب کو کھانا خود بنانا پڑتا تھا۔ ہاں، کبھی کبھار تنظیم کے قائدین لنگر کا انتظام کر دیتے تھے لیکن ہر کوئی اپنی اپنی روکھی سوکھی بنا ہی لیتا تھا۔ دونوں بابوں کا بھی کچھ وقت لکڑیاں جلانے اور پکانے میں گزر جاتا۔
طفیل کا فون آیا تو پروین سے بھی بات ہوئی۔ منظور کے لئے تو خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

"ابا جی میری اپنے دوست ریاض سے بات ہوئی ہے۔ بس تھوڑے دن اور انتظار کرنا پڑیگا۔ پھر قبضہ مل جائے گا۔ آپ کو کوئی مشکل تو نہیں؟"
مشکل ہوتی بھی تو منظور نے کہاں بتانا تھا۔ اس لئے وہ کہہ دیتا: "نہیں پتر نہیں، کوئی مشکل نہیں۔"
اُسکی تو ایک ہی خواہش تھی کہ کاش وہ بچوں کے لئے کوئی جائیداد چھوڑ سکے۔
"ہاں طفیل پتر، میرے پاس پیسے ختم ہو گئے ہیں وہ جلدی بھیج دے اور کوئی گرم کوٹ بھی بھیج دینا یہاں بہت سردی ہو گئی ہے۔"
"ٹھیک ہے ابا جی، ٹھیک ہے میں جلدی بھیج دونگا۔"
مگر آج ہفتہ گزر جانے کے بعد بھی کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔ منظور کے پاس تو اتنے بھی پیسے نہیں بچے تھے کہ موبائل میں لوڈ ہی کروالے۔

سردی اَب شدت اختیار کر چکی تھی۔ رفیق ہی اُسکے لئے خوراک کا بندوبست کر دیتا تھا۔ وہ اُس پر مزید بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ اسلئے اپنی ضرورتوں کا اُسکے سامنے تذکرہ نہ کرتا۔ اُسے گرم جرسی یا کوٹ کی اشد ضرورت تھی مگر بیٹے نے ایک دو بار فون کیا بھی تو پیسوں اور گرم کوٹ کے لئے محض تسلی دے کر ہی ٹرخا دیا۔ اور پھر دل میں کہتا: "اوہو، ابا جی کو کیا پتہ کہ میں یہاں کام میں کتنا مصروف ہوں، اوپر سے وہ دونوں بھائی ہیں: مقصود اور ناصر، جو بس اپنی ہی فکر میں لگے رہتے ہیں، چلو جلدی لنڈے بازار جاؤں گا تو کوئی کوٹ ابا جی کے لئے خرید لوں گا۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنے آپ کو بھی تسلی دے دی۔
ایک بھیگی رات میں منظور کو اپنے آپکو ہلکا کرنے کی خاطر خیمے سے باہر جانا پڑا۔ شدید سرد ہوائیں گولیوں کی مانند اُسکے بدن کو چھلنی کر رہی تھیں وہ یونہی کانپتا ہوا، بھیگا بدن لئے بستر میں لیٹ گیا۔
صبح رفیق نے حسب معمول آواز لگائی، "منظور . . . اوہ منظور . . . اٹھتا نہیں دیکھ دن کہاں چڑھ آیا ہے۔"
منظور بے حس و حرکت اپنی چارپائی پر پڑا تھا۔ رفیق نے اُسے ہلایا مگر اگلے ہی لمحے ٹھٹھک گیا۔ گزری رات بہت سرد تھی اُسی تاریک اور بھیگی رات کے کسی بدنصیب لمحے میں بے چارہ منظور بھی سرد ہو گیا تھا۔ پروین کی دی ہوئی چادر اَب بھی اُس کے بدن سے لپٹی ہوئی تھی۔ اُسی روز طفیل نے لاہور سے کچھ پیسے اور اپنے ابا کیلئے ایک گرم کوٹ روانہ کیا تھا۔

لمس

بینش ولیم جانسن/راولپنڈی

راحیل کو اس کمرے میں بیٹھے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا، کمرے کا بغور جائزہ لینے کے بعد اس کی آنکھیں تھک کر اس دروازے پر ٹک گئیں جہاں سے اس شخصیت نے آنا تھا جس کی خاطر وہ اتنا ذلیل وخوار ہو رہا تھا۔

قریب ایک گھنٹہ 17 منٹ کے طویل انتظار کے بعد دروازے سے ایک وجود کمرے میں داخل ہوا جسے دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کھڑا ہو گیا۔ جبکہ کمرے میں داخل ہونے والی اس مخلوق کو یہ گمان ہوا کہ اس لڑکے نے اس کے اعزاز میں اپنی نشست چھوڑی ہے۔ راحیل پہلی مرتبہ کسی کوٹھے پر آیا تھا۔ وہ یہاں کے آداب اور رسم ورواج سے ناواقف ضرور تھا البتہ اس کا ہوم ورک مکمل تھا۔

جرنلزم کا سٹوڈنٹ ہونے کے ناطے راحیل اپنے فائنل پروجیکٹ میں کوئی ایسا کارنامہ کرنا چاہتا ہے کہ اس کے کلاس فیلوز اور اساتذہ اس کی ذہانت اور نرالی سوچ کے قائل ہو جائیں۔ اس لیے وہ یہاں اس لڑکی کے سامنے بیٹھا تھا۔

کنول کوٹھے پر پیدا ہوئی اور یہیں کی ہو کر رہ گئی۔ باہر کی دنیا اور اس میں رہنے والے لوگ اس کے لیے خلائی مخلوق تھے۔ کنول ابھی اس پروفیشن کا حصہ نہیں بنی تھی لیکن جلد از جلد اس میں مہارت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس کی ٹریننگ کسی خودکش بمبار کی طرح کی گئی تھی جسے زندگی کے تمام پہلوؤں سے آشنا کر کے ہجوم کے بیچ و بیچ خود کو دھماکہ خیز مواد سے اُڑنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ ہر روز اسے اس بات کے لیے تیار کیا جاتا کہ وہ ایک طوائف ہے۔ بے بنیاد اور جھوٹی محبت کے میٹھے لڈو ہر روز اسے کھلائے جاتے اور کانوں میں شیریں لہجے کا رس گھولا جاتا تا کہ وہ ہر معیار پر پوری اُترے۔ اس غلیظ پیشے میں کام آنے والے تمام گر اس اس کے خمیر میں گندھ گئے تھے۔

راحیل خاص طور سے یہاں کنول سے ملنے اور اس کا انٹرویو کرنے آیا تھا۔ کیونکہ وہ جاننا چاہتا تھا ایک......طوائف......طوائف بننے سے پہلے کیا سوچتی ہے اور کیوں اس غلاظت میں کود جاتی ہے۔

رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد راحیل اس لڑکی کی تمام تر تیاری اور انداز کو نظرانداز کرتے ہوئے گویا ہوا ”مس کنول! آپ جانتی ہیں میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ مزید وقت ضائع کیے بغیر میں آپ کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔“

کنول انتہائی پرسکون نظر آ رہی تھی۔ البتہ وہ بار بار اپنی سیاہ اور صندلی رنگ کی ریشمی ساڑھی کا پلو کاندھے پر درست کرتی اور پاؤں کو اس طرح سے حرکت دیتی کہ اس کی پائل چھنک جاتی۔ اس حرکت سے راحیل مزید بے چین اور مضطرب ہو جاتا، وہ کچھ کہتے کہتے رُک جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ راحیل نے ابھی تک اس کے چہرے کو غور سے نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ کمرے میں داخل ہونے اور اس کے پاس آ کر بیٹھنے کے دوران ایک نظر جو اس نے کنول پر ڈالی تھی وہ اس کی آنکھوں کے رنگ میں ہی اٹک کر رہ گئی تھی۔ آنکھیں بھلے جیسی بھی ہوں پر وہ رنگ سمجھ سے باہر تھا۔ اسے ان آنکھوں میں قدرت کے ان دیکھے رنگوں کی جھلک نظر آئی جسے وہ بار بار دیکھنا چاہتا تھا۔

”آپ طوائف کیوں بننا چاہتی ہیں؟“

راحیل نے پہلا اور انتہائی بے تکا سوال کیا۔ جس کے جواب میں کنول نے اسے چونک کر دیکھا اور کتنی ہی دیر اس کا چہرہ تکتی رہی۔ وہ راحیل کی کالی سیاہ آنکھیں کھنگالتی رہی۔ راحیل کے نظر جھکانے اور پھر اُٹھا کر کنول کو دیکھنے تک اس کی آوارہ نظریں اس کے چہرے پر آوارہ گردی کرتی رہیں۔

”بہتر ہوگا اگر آپ میرے سوال کا جواب دیں۔“ کچھ دیر بعد راحیل نے کنول کی آوارہ نظروں کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

راحیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اس انداز سے مسکرائی کہ اسے اپنی نرکی بے باکی پر فخر ہو۔

”آپ ہمارے بارے میں کیا جانتے ہیں اور کیا جاننا چاہتے ہیں؟“ کنول نے پہلی مرتبہ

گفتگو میں حصہ لیا۔ راحیل نے اپنا سوال دوبارہ دوہرایا اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔

''آپ محبت کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟'' کنول کے اس سوال کے جواب میں راحیل نے کچھ کہنا چاہا۔ البتہ یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اب جو یہ بولی ہے تو بہتر ہے اسے ہی بولنے دیا جائے۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کنول غائب سوچ کہیں دور دراز کی دنیا سے ہو کر واپس وہاں حاضر ہوئی اور اس نے فلسفے کے کسی پروفیسر کی طرح وہیں سے بولنا شروع کیا جہاں سے چھوڑا تھا۔ ''آپ کے لیے محبت کیا ہے، میں نہیں جانتی لیکن ہمارے ہاں محبت آوارہ ہے، یہ کہیں بھی کیسے بھی گھس آتی ہے۔ اس کے ہاں اجازت لینے اور دستک دینے کا کوئی رواج نہیں۔ بس اسیر کر لیتی ہے اور پھر اپنی مرضی چلاتی ہے۔ خوب رُسوا کرتی ہے۔ چٹان جیسے پتھر دل کو موم بنا دینے میں اسے وقت نہیں لگتا۔''

کنول کے اس فلسفہ میں راحیل کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کیونکہ یہ اس کے سوال کا جواب نہیں تھا۔ اسے کنول کی عقل پر ہنسی آ رہی تھی جو بازار میں بیٹھی تھی اور ایک مرد کو محبت پر قائل کرنے چلی تھی۔

''مجھے محبت اتنی پسند ہے کہ اپنی روزی بھی اسی کے ذریعے کمانا چاہتی ہوں۔ ایک ایسی عورت بننا چاہتی ہوں جس کا دل محبت سے سرشار ہو، جو اپنے ہاں آنے والے ہر پیاسے کو محبت کے دریا سے سیراب کر دے، جس کی محبت کے قصے ہر کسی کی زبان پر ہوں۔''

''تمہاری اور تمہارے اس فلسفے کی ہماری دنیا میں کوئی اہمیت نہیں۔ یہ صرف تمہارا گمان ہے کہ ہمارے معاشرے کو تمہاری ضرورت ہے، تمہیں نہیں لگتا یہ گناہ ہے، برا کام ہے، غلاظت ہے؟'' کنول کی بات کاٹتے ہوئے راحیل نے بہت سارے سوال ایک ساتھ کر دیے۔

کنول نے پہلی بات وہی چھوڑتے ہوئے دوبارہ بولنا شروع کیا ''میں یہ سوچتی ہوں اس دنیا میں وہ گناہ گناہ نہیں جس کا جواز گناہ کرنے والے کے پاس موجود ہو۔ چوری کرنا کسی کی جان لے لینا گناہ ہے لیکن بھوکے کا روٹی چرانا اور سزائے موت کے قیدی کو لٹکا دینا گناہ نہیں کہلاتا۔ اگر گناہ میں پڑنے والا شخص آپ کو قائل کر لے کہ یہ سب وہ مجبوری یا کسی جواز کے تحت کر رہا ہے تو آپ کیا کہیں گے؟''

کسی بھی جاندار کی جان لینا یا اس کا خون بہانا گناہ ہے۔ ہمارے ہاں قصائی ہر روز کتنے جانوروں کی گردن پر چھری پھیر دیتا ہے۔ کسی بھی جاندار کی جان اپنے مزے کے لیے نکال لینا گناہ ہے لیکن اگر چھری پھیرنے سے پہلے ''اللہ ھو اکبر'' پڑھ لیں تو یہ گناہ نہیں رہتا، حرام نہیں بلکہ حلال ہو جاتا ہے۔ ''اللہ ھو اکبر'' ایک جواز ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو نعمت کے طور پر بخشا ہے۔ میرے پاس بھی اس کام کا جواز ہے جس کے بعد یہ میرے لیے حرام یا برا کام نہیں رہتا۔''

راحیل پڑھا لکھا، باشعور لڑکا تھا، اس کے باوجود وہ اس ان پڑھ، جاہل اور اپ کمنگ طوائف کی باتوں کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ جب وہ اس جگہ آیا تو اس کے دل میں کنول کے لیے کوئی جذبات نہیں تھے، اب بھی اس نے کچھ خاص محسوس نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی وہ چاہتا تھا کنول اس کام میں نہ پڑے، یہ بات وہ کنول سے کہہ دینا چاہتا تھا لیکن اس کے برعکس وہ کنول کی باتیں سن رہا تھا، انہیں دماغ کی کسوٹی پر پرکھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

اچانک کنول کی آواز اس کے کانوں میں پڑی، اس کا فلسفہ جاری تھا ''جس کے پاس جو چیز زیادہ ہوتی وہ اسے خیرات کر دیتا ہے، میرے پاس محبت زیادہ ہے، سو میں اسے ہی خیرات کر دینا چاہتی ہوں۔ اس جہاں میں سب کچھ مل جاتا ہے، سوائے محبت کے، محبت سب سے افضل ہے۔ میں نے دنیا کو صرف اپنے کوٹھے کی اس بالکونی سے دیکھا ہے اور مجھے تو یہی محسوس ہوا کہ اس دنیا میں رہنے والا ہر شخص محبت کے معاملے میں فقیر ہے۔ محبت کے بھوکے ان انسانوں کو سب کچھ خیرات میں مل جاتا ہے لیکن محبت کے معاملے میں یہ پیاسے ہی رہ جاتے ہیں۔ ان کا المیہ ہے انہیں محبت لینی آتی ہے پر دینی نہیں آتی۔ یہ چاہتے ہیں ان کے لیے ان کی محبت میں ہر کوئی ٹوٹ کر بکھر جائے۔ اپنا آپ گنوا دے لیکن یہ خود مکمل رہنا چاہتے ہیں، محبت سے لاتعلق اور بنجر دلوں والے ان فقیروں میں اپنے محبوب کو برباد کر دینے کا جذبہ ٹھاٹھیں مارتا ہے، انہیں نہ محبت کی پہچان ہے نہ محبت کرنے والے کی۔ نہ جانے طوائف کی جوٹھی گود میں انہیں کیا سکون ملتا ہے جو سب کچھ داؤ پر لگا کر آ جاتے ہیں ہماری چوکھٹ پر۔''

کنول کی باتیں سن کر اسے تھوڑی دیر کے لیے تو یہ گمان ہونے لگا کہ وہ جاہل ہے اور اس کے سامنے بیٹھی اوٹ پٹانگ بکنے والی یہ لڑکی کوئی سکالر ہے جس سے وہ لیکچر لینے آیا ہے۔ اس کا سر چکرانے لگا، وہ انٹرویو بھول چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ راحیل اس تھرڈ کلاس ان پڑھ لڑکی کے فلسفے پر قائل ہو جاتا اس نے اپنا ریکارڈ بند کیا، بستہ اُٹھایا اور وہاں سے چلتا بنا، سیڑھیاں اُترتے وقت اس کے دل میں ایک مرتبہ ان آنکھوں کا خیال آیا جنہیں چند لمحے پہلے وہ گھور رہا تھا، اس خیال کے تعاقب میں اسے اپنی اسائنمنٹ کا خیال آیا جس کے فوراً بعد وہ کوئی دوسرا ٹاپک سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

راحیل کا یوں اُٹھ کر جانا کنول کے دل پر اثر کر گیا۔ وہ افسردہ سی ہو کر اسی بالکونی میں کھڑی ہو گئی اور اپنی نظر سے دنیا کو دیکھنے لگی۔ شام ڈھل چکی تھی، راحیل اور پرندے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اگلا سال چڑھتے ہی وہ 17 برس کی ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر وہ اور بھی غمگین ہو گئی کہ اس کی آدھی جوانی گزر چکی اور ابھی تک وہ، وہ نہیں بن پائی جو وہ بننا چاہتی ہے۔ کنول شدت سے سوچنے لگی کہ آج تک اس کا سودا کیوں نہیں کیا گیا۔ ہر روز سوداگر آتے ہیں لیکن کوئی اس کی قیمت نہیں لگاتا۔ ایسی کیا بات تھی کہ سودا ہوتے ہوتے رہ جاتا۔

کنول ابھی اسی سوچ میں غرق تھی کہ اسے آواز پڑ گئی۔ یقیناً آج قسمت نے اسے نہیں بخشا، اس کا سودا ہو چکا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک درمیانی عمر کا مرد اس کے کمرے میں موجود تھا۔ کنول اس کے لیے لوازمات اکٹھے کر رہی تھی، چائے کی پیالی کنول نے جو پیش کی تو اس محبت کے پیاسے شخص نے جھپٹ کر کنول کی کلائی تھام لی۔ جیسے کنول اس پیاسے کی پیاس بجھائے بغیر کہیں دور بھاگنے لگی ہو۔ کنول ہڑبڑائی اور چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اس نے نظر اٹھا کر اس پیاسے کو دیکھا جسے وہ محبت کے سمندر میں غوطے دینا چاہتی تھی۔

لیکن اس شخص کی سفاک سرخ آنکھوں سے ٹپکتی ہوس، چبھتی نظریں اور کلائی پر محسوس ہونے والے اس وحشت ناک اور بیگانے لمس نے کنول کے جسم میں چبھن بھر دی۔ اس کا دل مردہ اور محبت دھواں ہو گئی۔ ان لمحات کے بعد اسے سمجھ آ گیا کہ ہر کسی کو محبت کی بارش میں نہلانے سے پہلے اسے خود محبت کے سمندر میں غوطے کھانے ہوں گے۔ ڈوبنا ہوگا، اپنی ذات کی نفی کرنی ہوگی۔ اس کے چہرے سے جھلکنے والا کرب اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ محبت آوارہ ہے نہ خیرات کی جاسکتی ہے، ہر کسی کے سامنے اپنے وجود کی نفی کرنا آسان نہیں، کیونکہ وہ واقعی ہی افضل ہے، محبت کا لمس کچھ اور ہوتا ہے۔

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیرادارت شائع ہونے والا مجلہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ چودہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے

اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمراء: 24-j ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

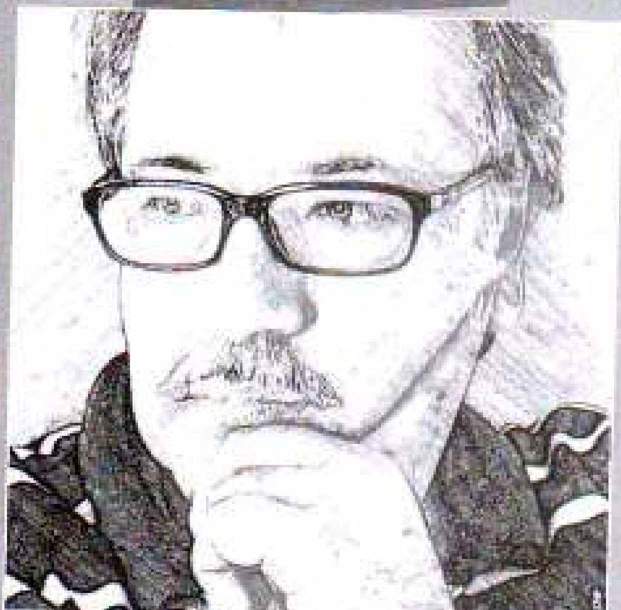

''اندھیرے میں جگنو'' محمود ظفر اقبال ہاشمی کا دوسرا ناول ہے اس سے قبل اُن کا ناول سفید گلاب شائع ہو چکا ہے۔ مجھے عزیز دوست خالد شریف نے ان کا یہ ناول پڑھنے کے لیے دیا۔ شاعروں کے لیے ناول پڑھنا مشکل کام ہوتا ہے۔ وہ ایسی لائن پڑھنے کے عادی ہوتے ہیں جس پر ''واہ'' کہہ سکیں۔ میں بھی ناول پڑھتے ہوئے ہمیشہ اس مشکل سے دوچار رہا ہوں۔ نثر دل پذیر اور لائنیں چونکانے والی ہوئیں تو پڑھ پایا ورنہ چند ایسے ناول جنہوں نے فروخت اور مقبولیت کے حوالے سے شہرت پائی مجھ سے بمشکل ان کے چند صفحات پڑھے جا سکے۔ گزشتہ دو دہائیوں میں خواتین ناول نگاروں نے مقدار کی حد تک اس صنف میں کافی کام کیا ہے۔ قارئین کی اکثریت چونکہ سطحی سوچ کی حامل ہوتی ہے۔ اس لیے اُن میں یہ ناول کافی مقبول ہوئے۔ اُردو میں عالمی معیار کا ناول بہت کم لکھا گیا۔ اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے والے قارئین کی محدودیت کے باعث زیادہ پڑھا بھی نہیں گیا اس لیے یہاں وہ فضا مجموعی طور پر بن ہی نہیں پائی جس میں ملکی یا عالمی سطح پر کسی زبان کے ادب کو پذیرائی یا اہمیت ملتی ہے۔ ''اندھیرے میں جگنو'' اپنے پلاٹ، کردار سازی کرافٹ، مکالمہ اور امیجری کے لحاظ سے مکمل ناول ہے۔ کہانی کے قالین میں مختلف موضوعات کی بنت کر کے اس کو رنگین اور دلچسپ بنایا گیا ہے۔ رومانویت میں گندھا ہوا یہ ناول قاری کو جہاں دل پذیر طرزِ تحریر کے باعث حظ اُٹھانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ وہاں نابینا کردار فواد کے جملے ذہن میں علم و دانش کے نئے دریچے وا کرتے ہیں۔ امیجری شاعرانہ اسلوب کی پروردہ ہے۔ جہاں منظر نگاری کی گئی ہے وہاں ایک ایسا جہانِ طلسم آباد ہے جس کی فضا سے باہر آنا قاری کے لیے آسان نہیں اور ناول ختم ہونے کے بعد بھی یہ جہانِ طلسم اُس کے اندر آباد رکھتا ہے۔ اس ناول کی سب سے بڑی خوبی قابلِ مطالعہ ہونا ہے اور موضوع کی انفرادیت ہے۔ قاری ایک بار اس کو شروع کرے تو پھر جب تک مکمل ناول ختم نہ کر لے بے چینی کی کیفیت سے دوچار رہتا ہے۔ محمود ظفر اقبال ہاشمی زندگی سے متعلق گہرا تجربہ، مشاہدہ اور شعور رکھتے ہیں جس کی جھلک ان کے ناول کے کرداروں کے مکالموں میں ملتی ہے۔ ایک ناول تو ہر شخص کے پاس ہوتا ہے۔ ناول نگار وہی ہے جو دوسرا ناول لکھتا ہے۔ محمود ظفر اقبال ہاشمی نے ''سفید گلاب'' کے بعد ''اندھیرے میں جگنو'' لکھ کر خود کو مستند ناول نگار منوا لیا ہے۔ اُمید ہے وہ اس صنف میں مزید کام کریں گے اور اسی طرح خوبصورت اور دل پذیر ناول نذر قارئین کرتے رہیں گے۔ مجھے ان کے تیسرے ناول کا شدت سے انتظار ہے۔

ناشر: ماورا، دی مال، لاہور

نام کتاب: اندھیرے میں جگنو • ناول نگار: محمود ظفر اقبال ہاشمی • صفحات: 440 • قیمت: 900 روپے • تبصرہ نگار: حسن عباسی

ماہی آرٹس اینڈ کلچر آسٹریلیا کی شام "غزل"

ماہی آرٹس اینڈ کلچر (آسٹریلیا) کے زیرِ اہتمام "شامِ غزل" گزشتہ دنوں سڈنی میں منعقد ہوئی۔ اس خوبصورت "شامِ غزل" کا اہتمام ہمالیہ ریسٹورنٹ گرین ویل (Granville) میں کیا گیا جس میں پاکستان، انڈیا اور افغانستان کی کمیونٹیز نے بھرپور شرکت کی۔ اس شامِ غزل کی خصوصیت اور انفرادیت یہ تھی اس میں شاعری اور گائیکی کے ملاپ سے نیا پن پیدا کیا گیا۔ اس لیے اس تقریب میں پاکستان کے نامور گائیک غلام عباس اور ممتاز شاعر حسن عباسی کو مدعو کیا گیا۔ تقریب کے مہمانِ خصوصی پاکستان کے آسٹریلیا میں قونصل جنرل عبدالعزیز اُکیلی تھے۔ حسبِ معمول تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد ماہی آرٹس اینڈ کلچر کے روحِ رواں ظفر خان اور ماہا خان نے آسٹریلیا میں ماہی آرٹس اینڈ کلچر کے قیام اور اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور پاکستان سے تشریف لائے ہوئے مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ انھوں نے سڈنی میں پاکستانی کمیونٹی کے افراد کا بطورِ خاص شکریہ ادا کیا جن میں پاکستان آسٹریلیا ایسوسی ایشن کے صدر اعجاز خان، ڈاکٹر جاوید، ڈاکٹر اکرم حسن، ڈاکٹر مدنی، ندیم شیخ، سید وسیم شاہ، امتیاز چودھری، ارشد سعید (شاعر)، جاوید رانا، ظفر حسین شاہ، رابطہ میگزین کے انچارج محمد منیر اور تاج محل ایونٹس کے طاہر صاحب شامل ہیں۔ شاہد جاوید نے پاکستان سے آئے ممتاز شاعر اور سفرنامہ نگار حسن عباسی کو مدعو کرنے سے قبل اُن کی فن و شخصیت کے حوالے سے گفتگو کی اور حاضرین کو تعارف کرایا۔

شامِ غزل دو حصوں پر مشتمل تھی پہلے حصہ میں شاعری اور دوسرا حصہ میں موسیقی کا پروگرام تھا۔ حسن عباسی حاضرین کی بھرپور تالیوں کی گونج میں اسٹیج پر جلوہ افروز ہوئے۔ سب سے پہلے انھوں نے ماہی آرٹس اینڈ کلچر کی آرٹ اور ادب کے حوالے سے خدمات کو دل پذیر انداز میں سراہا اور اپنے میزبانوں ظفر خاں اور ماہا خان کا شکریہ ادا کیا اور انھیں شاندار شامِ غزل کے انعقاد پر مبارک باد پیش کی۔ اس کے بعد حسن عباسی نے اپنی حمدیہ، ملی، نظمیہ اور غزلیہ شاعری سنا کر حاضرین کے دل جیت لیے اور بھرپور داد سمیٹی۔ حسن عباسی کی دل پذیر شاعری سے سامعین خوب محظوظ ہوئے۔ اس کے بعد پُرتکلف ڈنر کا اہتمام تھا۔ ڈنر کے بعد پاکستان کے نامور گائیک غلام عباس نے تالیوں کی گونج میں اسٹیج سنبھالا اور میزبانوں اور مہمانوں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد فضا میں سُر بکھیرنے اور اپنی آواز کا جادو جگانا شروع کر دیا۔ غلام عباس نے اپنی خوبصورت آواز اور سدا بہار گیتوں سے سامعین پر سحر طاری کر دیا۔ وہ مستی کے عالم میں جھومتے رہے۔ ہر گانے کے اختتام پر ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھتا۔ نصف شب گزرنے کے بعد بھی محفل جمی ہوئی تھی اور ابھی حاضرین کی تشنگی باقی تھی کہ بامرِ مجبوری وقت محفل برخاست کرنا پڑی۔ آسٹریلیا میں پاکستان کے قونصل جنرل عبدالعزیز اُکیلی نے ماہی آرٹس اینڈ کلچر کو شاندار "شامِ غزل" کے انعقاد پر بھرپور مبارک دی۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کے پروگرام پاکستانی کمیونٹی کے لیے غنیمت ہیں۔ اُمید ہے کہ مستقبل میں بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ آخری میں ظفر خاں اور ماہا خاں نے ایک بار پھر تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

مختصر سے مختصر ہو جاؤں گا
میں تو ہوں اک پل بسر ہو جاؤں گا
تیرے بن میں اک اندھیری رات ہوں
تم چلے آؤ سحر ہو جاؤں گا
شوق سے گزرو جو چاہو جس طرف
میرا کیا ہے میں اُدھر ہو جاؤں گا
جانبِ منزل چلوں گا جب کبھی
آپ اپنا ہم سفر ہو جاؤں گا
گر مجھے دنیا میں پھر بھیجا گیا
سائباں کوئی شجر ہو جاؤں گا
جی رہا ہوں کب سے مردوں کی طرح
مر گیا تو میں امر ہو جاؤں گا
ہے کمالِ زندگی گر یہ ظفر
آج سے میں بے ہنر ہو جاؤں گا

❀ ❀ ❀

شعر ہم پر اُترتے رہے رات بھر
اور ہم جیتے مرتے رہے رات بھر
دم بدم ہم ظفر قلزمِ اشک میں
ڈوبتے اور اُبھرتے رہے رات بھر

ظفر خاں، آسٹریلیا

لاہور ادبی فورم کے زیر اہتمام

آسٹریلیا میں مقیم منفرد لہجے کے خوبصورت شاعر وحید قندیل کے تیسرے شعری مجموعے

''مونا لیزا ایک تصویر'' کی تقریب پذیرائی

ڈاکٹر صغرا صدف نے صدارت کی مہمان خصوصی نیلما ناہید درانی جبکہ مہمانِ اعزاز رخسانہ نور تھیں

اقبال راہی نے منظوم خراجِ تحسین پیش کیا۔ ملک سلیم اختر کی دل پذیر نظامت نے تقریب کو مزید خوبصورت بنا دیا

حسن عباسی، افتخار شوکت چوہدری اور ندیم بھٹی کا لاہور ادبی فورم کو مزید فعال بنانے کا عزم مستقبل میں یادگار تقاریب کا انعقاد کریں گے

آسٹریلیا (میلبورن) میں مقیم معروف شاعر اور سفرنامہ نگار وحید قندیل کے تیسرے شعری مجموعے ''مونا لیزا ایک تصویر'' کی تقریب پذیرائی لاہور ادبی فورم کے زیر اہتمام الزمر ریسٹورنٹ میں ہوئی۔ تقریب کی صدارت نامور کالم نویس، شاعرہ اور ڈائریکٹر پلاک ڈاکٹر صغرا صدف نے کی۔ جبکہ مہمان خصوصی وحید قندیل تھے۔ نظامت کے فرائض ملک سلیم اختر نے بخوبی نبھائے۔ تقریب کے آغاز سے قبل چیئرمین لاہور ادبی فورم افتخار شوکت نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا جبکہ سرپرست اعلیٰ حسن عباسی نے وحید قندیل اور دیگر مہمانوں کا تعارف بھرپور انداز میں کرایا۔ یہ تقریب دو ادوار پر مشتمل تھی۔ پہلے حصے میں وحید قندیل کی فن و شخصیت کے حوالے سے اظہار خیال کیا گیا اور دوسرے حصے میں محفل مشاعرہ ہوئی، اظہار خیال میں مقالہ نگاروں نے وحید قندیل کی شخصیت اور شاعری کو سراہا۔ زاہد محمود شمس نے وحید قندیل کی شاعری کو عصر حاضر کی شاعری کہا۔ ناز اوکاڑوی نے وحید قندیل کے شاعرانہ اسلوب کی تعریف کی۔ ڈاکٹر نادر علی شاہ نے انھیں منفرد لہجے کا شاعر قرار دیا۔ حسن عباسی نے وحید قندیل کی شاعری میں سادگی اور شگفتگی کو سراہا۔ فراست رضوی اور اقبال راہی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقع پر زاہد محمود شمس نے صاحب شام کو پھول پیش کیے۔ محفل مشاعرہ میں جن شعراء کرام نے کلام پیش کیا ان میں ڈاکٹر صغرا صدف، نیلما ناہید درانی، ڈاکٹر عمرانہ مشتاق، تسنیم کوثر، حسن عباسی، اقبال راہی، ناز اوکاڑوی، ڈاکٹر نادر علی شاہ، زاہد محمود شمس، فراست بخاری شامل ہیں۔ صاحب صدر ڈاکٹر صغرا صدف نے تقریب کو بہت خوبصورت اور یادگار قرار دیا اور وحید قندیل کی شاعری کو جوان جذبوں کی شاعری قرار دیا۔ آخر میں وحید قندیل نے اپنی زندگی سے متعلق مہمانوں کو بتایا اور خوبصورت کلام پیش کر کے محفل لوٹ لی۔ تقریب کے آخر میں چیئرمین لاہور ادبی فورم افتخار شوکت نے اظہار خیال کیا۔ جبکہ ندیم بھٹی نے اپنے اظہار خیال میں اس عزم کا اعادہ کیا کہ مستقبل میں بھی ایسی تقاریب کا انعقاد کرتے رہیں گے۔

تقریب میں وحید قندیل، مسز وحید قندیل اور ان کے اہل خانہ نے بھی شرکت کی۔ آخر میں پرتکلف ڈنر کا اہتمام تھا۔

حسنین اصغر تبسم کے اعزاز میں پروفیسر تیمور حسن کی جانب سے تقریب پذیرائی

وطن عزیز کے معروف نوجوان شاعر حسنین اصغر تبسم کے شعری مجموعے "چلو پھر کہانی شروع کریں" کی اشاعت کی خوشی میں معروف شاعر پروفیسر تیمور حسن نے گزشتہ دنوں گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ لاہور میں حسنین اصغر تبسم کے اعزاز میں ایک پر وقار عصرانے کا اہتمام کیا عصرانے میں دنیائے ادب کی قابل قدر شخصیات قائم نقوی، عباس تابش، حسن عباسی، عامر بن علی، سید سہیل عابدی، عنبر عباس زیدی، ندیم عباس عابدی نے خصوصی شرکت کی حسنین اصغر تبسم نے اس موقع پر مذکورہ بالا تمام ادبی، علمی شخصیات کا شکریہ ادا کیا کہ جنہوں نے ان کے اعزاز میں منعقدہ اس تقریب میں شرکت کی بالخصوص معروف شاعر پروفیسر تیمور حسن جنہوں نے یہ خوبصورت بزم سجائی تھی کا بے حد شکریہ ادا کیا۔ معروف شاعر قائم نقوی نے حسنین تبسم سے اپنی ماضی کی یادوں اور ملاقاتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے حسنین اصغر تبسم کے شعری مجموعے کی اشاعت پر دلی مسرت کا اظہار کیا ۔معروف شاعر تابش نے اپنی گفتگو میں حسنین اصغر تبسم کو 1980ء کی دھائی کے شعراء میں سینئر اور بڑا شاعر قرار دیتے ہوئے ان سے اپنے دیرینہ تعلق اور دوستی پر فخر کا اظہار کیا۔

مزید عباس تابش نے کہا کہ حسنین کے شعری مجموعے کی اشاعت پر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور اس حوالے سے حسنین کو خوش قسمت بھی سمجھتا ہوں کہ اسے سہیل عابدی جیسا بھائی ملا ہے جو خود بھی بے حد خوبصورت شاعری کرتا ہے مگر اس نے اپنی کتاب کے بجائے گردش زمانہ کی زد میں آئے ہوئے اپنے بڑے بھائی کے شعری مجموعے کی اشاعت کو مقدم سمجھا۔ اس موقع پر میں برادر عزیز سہیل عابدی کو خراج تحسین پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں معروف شاعر حسن عباسی نے حسنین اصغر تبسم کے شعری مجموعے کی اشاعت کو ادبی لائبریری میں ایک اور خوبصورت کتاب کا اضافہ قرار دیتے ہوئے کہا کی حسنین اصغر تبسم کی شاعری نے ہمیشہ ہی قارئین کو متاثر کیا ہے اسی لیے وہ ادبی حلقوں بالخصوص نوجوانوں میں پسندیدہ شاعر سمجھے جاتے ہیں معروف شاعر عامر بن علی نے کہا کہ حسنین اصغر تبسم ہمارے ضلع خانیوال یا کبیر والا ہی کا فخر نہیں ہیں بلکہ ان کی شاعری کو گونج پوری ادبی دنیا میں سنائی دیتی ہے لہذا اگر میں انہیں ادبی دنیا کا فخر قرار دے دوں تو غلط نہ ہوگا عامر بن علی نے مزید کہا کہ میرے بے حد پیارے دوست سہیل عابدی کی حسنین بھائی کے شعری مجموعے کی اشاعت کیلئے بھرپور کاوشوں پر انہیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ معروف شاعر سہیل عابدی نے تیمور حسن اور تمام احباب کی محبتوں کا شکریہ ادا کیا، میزبان تقریب تیمور حسن نے حسنین اصغر تبسم کو شعری مجموعے کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا مجھے فخر ہے کہ آج دنیائے ادب کا ایک بڑا نام حسنین اصغر تبسم میرے مہمان ہیں میں عرصہ دراز سے ان کی شاعری کا دلدادہ ہوں ،آخر میں خوبصورت شعری نشست میں حسنین اصغر تبسم ، قائم نقوی، عباس تابش، حسن عباسی، عامر بن علی، سہیل عابدی اور تیمور حسن نے اپنا اپنا کلام سنایا اس طرح کتاب کی اشاعت کے بعد حسنین اصغر تبسم کے اعزاز میں منعقد ہونے والی یہ پہلی تقریب اپنے اختتام کو پہنچی،

(رپورٹ عنبر عباس زیدی)

قلاش

محمود ایاز

''میں نے دو محبتیں کیں۔۔ اور دونوں کو بھوک نگل گئی۔۔۔!''

اُس کی بڑی سیاہ آنکھیں حیرت سے مزید کھل گئیں۔۔ کچھ دیر تک وہ مجھے ایسے دیکھتی رہی کہ جیسے میں کسی دوسری دنیا سے آیا ہوں۔۔ اور وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔۔ جب اُس کی پلکیں بھیگنے لگی تو بولی۔۔۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''بھوک۔۔۔ تمہارے نزدیک ایک سطحی جذبہ ہوگا، ایک ایسی عامیت جسے تم نے کبھی محسوس ہی نہ کیا ہو۔ جیسے غریب کبھی اپنی دولت کا حساب نہیں دے پاتا۔۔ جانتی ہو میں جس گھر میں پیدا ہوا اُس کی بنیادوں میں بھوک بھری تھی، مجھے اس گھر کو روٹی سے بھرنا تھا۔۔ مگر روٹی کی قیمت ہوتی ہے اور میں نے وہ روٹی اپنے خواب بیچ کر خریدی''

''یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟ یہ آج تمہیں کیا ہوگیا ہے۔۔؟'' اس کے لہجے میں کرب تھا، پریشانی تھی۔۔

''میں اُن لوگوں کی طرح نشے میں نہیں ہوں جو دوسروں کو حقیقت سے کہیں دور لے جاتے ہیں اور ایسی دُنیا دکھاتے ہیں جہاں زندگی کی سب سے بڑی حقیقت محبت ہوتی ہے۔ یہ دنیا جہاں تم نے اور میں نے آنکھ کھولی ہے، محبت کی حیثیت سوائے دودھیا جسموں کو بھنبھوڑنے کے سواء کچھ نہیں۔ یہاں سب سے بڑی حقیقت بھوک ہے جو ہمارے جسموں پر حکم چلاتی ہے، ہمارے خوابوں کو کھا جاتی ہے۔

مجھے یاد ہے وہ شام جب شہر کے کنارے میں اپنی مٹھیاں بھینچے بیٹھا تھا اور وہ میرے کندھے سے سر لگائے بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور میری آنکھیں کسی صحرا کی طرح خشک اور ویران تھیں۔۔ وہ شام اُس نے میرے کندھے پر سر لگائے ہی گزار دی اور پھر جاتے ہوئے اُس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ کاش! تمہارے سینے پر بھوک کا بھاری پتھر نہ ہوتا۔۔!

کون۔۔۔؟ ہاں کون اُسے سمجھاتا کہ ہر دن ٹوٹی ہوئی بسوں میں بیکار لوگوں کو خواب بیچ کر اُس تک پہنچا ہوں۔۔ کون اُسے سمجھاتا کہ ہر رات شہر کی خنکی میرے پھٹے ہوئے کپڑوں سے ہوتی ہوئی میرے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے۔۔۔ تو میں اُس کی محبت کے تصور سے اپنے وجود کو حرارت بخشتا رہا ہوں۔۔ مگر میری بھوک۔۔ میری محبت کو کھا گئی۔۔!'' میرے دل سے اک آہ نکلی۔۔

''اور دوسری محبت؟''

''مجھے وہ رات بھی یاد ہے جب سناٹے سے لڑ کر میں اُس سے ملنے پہنچا تھا۔ وہ بالکونی پر کھڑی عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں غرور تھا، التجا تھی یا پھر کچھ اور۔۔ میں سمجھ نہیں پایا۔ مجھے وہ کسی شہزادی کی طرح لگی جو اپنے دیوانے کی بے بسی کا مزہ لے رہی ہو۔ اُس نے اک نظر میری آنکھوں کی طرف دیکھا اور اُس ایک نظر میں اُس نے مجھ سے ساری باتیں کہہ دی۔۔

اُس نے بتایا کہ میں شہزادی ہوں اور تمہاری حیثیت ایک کیڑے جیسی ہے جو صبح رزق کی تلاش میں نکلتا ہے اور رات ہوتے ہی کسی دیوار کے کونے سے لپٹ کر سو جاتا ہے۔ اُس نے کہا تم ساری عمر رینگتے ہی رہو گے، کبھی شہزادے نہیں بن سکتے۔ پھر اُس کی آنکھوں میں حقارت اُتر آئی اور میری آنکھوں میں ایک شہتیر۔ جسے میں نے اپنی چھوٹی اُنگلی سے صاف کرنے کی کوشش کی۔۔ اُس نے میرے وجود سے نگاہیں پھیر لیں۔۔ اور خالی سڑک کو دیکھنے لگی۔ ٹھیک اُسی لمحے ایک بڑی سی کار میرے سامنے سے گزری۔۔ وہ آنسو جو کسی شہتیر کی طرح میری آنکھوں میں اٹکا ہوا تھا، گر پڑا۔۔ میں نے اُس شہزادی سے کچھ نہیں کہا۔ بس وہاں سے بھاگ پڑا۔۔ اُس کار کے پیچھے جو میرے قلاش ماضی کو نیچے روندتے ہوئے گزری تھی۔۔''

''رُک کیوں گئے؟'' میں کچھ لمحے کے لیے رُکا تو وہ بولی۔۔

''تم جانتی ہو زندگی میں مجھے تمہاری طرح پھولوں کی سیج پر نہیں ملی۔۔ زندگی مجھے آگ کی اس

بھٹی میں ملی جس نے ہر پل میرے وجود کو جھلسایا ہے۔۔ میں بہت مجبور تھا۔۔ اتنا کہ شاید تم سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں نے جب آنکھ کھولی تو میرے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ اور میری پیٹھ پر ایک گرتی ہوئی دیوار تھی جس کا بوجھ میں اُٹھائے ہوئے تھا۔ میری آنکھوں میں جب کوئی آرزو جاگی تو میری ماں کی آنکھیں بجھنے لگیں، میرے دل نے جب کسی تمنا کے پھول کو چنا تو میرے باپ کا چہرہ مرجھا گیا۔ میں کیسے کسی خواہش کے پیچھے بھاگتا؟ کیسے کسی خواب کو سینے میں پالتا۔۔ جب میرے اپنے اُس گرتی ہوئی دیوار کے نیچے کھڑے تھے جس کا بوجھ میں اُٹھائے ہوئے تھا۔

تو اُس رات میں دیوانہ وار اُس کار کے پیچھے بھاگتا چلا گیا جب تک وہ کار کسی گھر میں داخل نہ ہوئی اور پھر اگلی صبح میں اپنے سب سے قیمتی کپڑے پہن کر تمہارے سامنے کھڑا تھا۔ بس پھر وہی ہوا۔۔ شطرنج کی اس بساط پر مہرے نے اپنی چال خود چلنا شروع کی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ قدم انتہائی خطرناک ہے لیکن وہ زندگی بھر جیت سمیٹنے والے کھلاڑیوں سے پٹنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر کتنی ہی شامیں تمہارے ساتھ نہر کے کنارے گزریں، اور کتنی ہی صبحیں تمہارے پہلو میں جھوٹی انگڑائیاں لیتے ہوئے۔ لامتناہی وعدوں اور جھوٹے خلوص میں گندھی ہوئی باتوں کا ایک سلسلہ چل پڑا۔۔

تم مجھے بزدل کہہ سکتی ہو، کمزور اور بے غیرت بھی کہہ سکتی ہے مگر آزادی میرا حق ہے، آزادی تو کیڑوں کا بھی حق ہوتا ہے! خوراک اُن کے سامنے پھینک دی جاتی ہے وہ چاہیں تو اُس پر لپکیں یا بھوک کو سینے سے لگا کر دم توڑ دیں۔ مگر یہاں۔۔ بڑی بڑی دوکانوں پر کھانے سجا کر باہر ہم جیسے بھوکوں کو کھڑا کر دیا جاتا ہے۔۔ صدیوں سے میرے آباؤ اجداد بھوک کو سینے سے لگا کر دم توڑتے رہے ہیں۔۔ بڑے بڑے محلوں اور شیشے میں اُتری ہوئی عمارتوں کو دیکھ کر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے رہے ہیں۔ اچھے وقت کے دلاسے دیتے رہے ہیں۔۔ آخر کب تک تم کسی آدمی کا صبر آزما سکتے ہو؟ کسی کے اندر تو ضبط کا لاوا پھوٹنا تھا۔۔ سو میرے اندر وہ لاوا پھوٹ پڑا۔۔۔ اویسے بھی کیا فرق پڑتا ہے کہ اگر کسی امیر کے خزانے سے چند روپے چوری ہو جائیں!

''تو تم نے اپنی بھوک مٹانے کے لیے میرا استعمال کیا؟ کیونکہ میں کسی امیر زادے کی بیٹی تھی؟'' اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر تھا۔۔

''ہاں! میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔۔ کیونکہ آج میں پہلی بار سچ بول رہا ہوں۔ تم میرے لیے منزل پر پہنچنے کا ایک ذریعہ تھیں۔۔ ایک ایسی سیڑھی جس پر چڑھ کر میں صدیوں کا سفر طے کر سکتا تھا۔۔ اور آج جب میں منزل پر پہنچ چکا ہوں تو اب اُس سیڑھی کی ضرورت نہیں ہے۔!''

''کیا بگاڑا تھا میں نے تمہارا۔۔'' اُس نے روتے ہوئے میرے گریبان پکڑ لیا۔۔ ''بتاؤ کیا بگاڑا تھا میں نے تمہارا۔۔۔ میں نے تم سے محبت کی، تم پر اعتبار کیا۔۔۔ تمہارے ساتھ خواب دیکھے۔۔۔ تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے تھا۔۔ صرف ایک بار۔۔ ہاں۔۔۔ صرف ایک بار کہتے کہ مجھے تمہاری دولت چاہیے۔۔ یقین کرو میں سب کچھ تمہارے نام کر دیتی۔۔ تم نے تو مجھ پر اتنا بھی اعتبار نہ کیا۔!''

''پاگل لڑکی۔۔! میں تمہارے آنسوؤں سے نہیں پگھلنے والا، مجھ پر تمہاری آہوں کا اثر نہیں ہونا۔۔ ٹھکرائے جانے کا انجام تو یہی ہے۔ اور میں تو وہ شخص ہوں جو صدیوں سے ٹھکرایا جاتا رہا ہوں، میری آہوں سے میرے خشک ہونٹوں پر پپڑیاں جمی رہی ہیں اور میرے آنسوؤں سے میری آنکھیں جلتی رہی ہیں۔ اور کون کرتا ہے آج کے دور میں محبت؟ کون دیکھتا ہے ایسے خواب جن کے مقدر میں کرچیاں لکھی ہیں؟ یہاں ہر جذبہ مفاد سے جڑ کا ایک عفریت بن جاتا ہے۔'' میرے لہجے میں نسلوں کا انتقام تھا۔۔ میں نے دھیرے سے اُس کے دونوں ہاتھ اپنے گریبان سے چھڑائے۔۔ وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے ہوئے گھٹنوں پر بیٹھ گئی۔۔ اور میں بڑے اطمینان سے پارکنگ کی جانب چل دیا جہاں میری کار کھڑی تھی۔

نامور و ممتاز شاعر حسن عباسی
کا پہلا احمدیہ مجموعہ

سائیں

طباعت کے آخری مراحل میں ہے
نستعلیق مطبوعات
فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور

ارواح

محمد ابصار

ٹیڑھی میڑھی لکیروں نے کاغذ کے ایک حصے کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا جس میں کچھ رنگ قید تھے۔ طرح طرح کے رنگ جو ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے، مگر ہر رنگ اپنے حصے میں اپنی ذات صاف بیان کرتا اور دوسرے رنگ سے ملاپ پر اُس میں فنا ہو جاتا۔ ایک حصے پر لکیریں درخت کی شاخوں کی طرح سایہ دار تھیں۔ ان لکیروں میں ایک جگہ ربط بھی تھا، جسے دیکھنے سے احساسات بے ربط ہو جاتے، یہ جگہ اعتبار ہیت کی رو سے گلاب کے پتوں کی طرح اور میرے مطابق گلاب کی کلی نظر آتی، یہ دراصل ہونٹ تھے۔ ایک حصہ ایسا بھی تھا جسے دیکھتے ہی سراب کا گماں ہوتا سو جب تک آنکھیں کھلی رہیں گی ہر سو سراب نظر آئے گا۔ اِس سراب میں ایک عجیب سی آواز تھی۔

ایک ایسی آواز جس میں گھر کی اپنائیت تھی۔

یہ آنکھیں تھیں۔

جسے کورے کاغذ پر میں نے تخلیق کیا تھا۔

جس کے نقش میں مَیں اپنی روح کو اُتارے رکھتا کالی رات جیسے اُس کے بال تھے۔ جن سے کھیلتے کھیلتے میرے سر کے بال سپید ہو گئے تھے۔ سراب جیسی آنکھوں میں مَیں نے ڈیرے ڈال لیے تھے جہاں عجیب سی آوازوں کا گشت رہتا تھا۔ رات ہو جاتی مگر میں اُس کی آنکھوں سے واپس نہ لوٹ پاتا۔ لکیروں کے اس حصار کی وجہ سے مجھے گزرے ہوئے سب دن یاد ہیں جب اُس کی گڑیا بھی اُس کے ساتھ رہتی تھی۔ جب گڑیا پرانی ہو کر ٹوٹ گئی تو فاطمہ بہت روئی، جس کا مجھے ابھی بھی رنج ہے۔

مجھے اب بھی وہ وقت یاد ہے جب وہ تپتی دھوپ میں کپڑے سکھانے چھت پر آیا کرتی تھی، میں اُس کے ہاتھوں سے تار پر لٹکتے کپڑے گنتا، گیلے کپڑوں سے برستی بارش کو اپنے بدن پر محسوس کرتا۔ تپتی دھوپ میں اُس کے لمبے کالے بالوں کے جھولنے کے ساتھ جھولتا، شرابی کی طرح ڈگمگاتا۔

یہ سب باتیں یادوں میں بدل چکی ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا چکی ہے، اُس کی یادوں میں گرتے ہوئے میرے آنسوؤں کا دامن سراب ہے، جنھیں میں فاطمہ کی تصویر پر گرنے سے بچاتا، اُس کی کشید کردہ تصویر کو، رنگ برنگوں کو دیکھتا اور اُس کی روح کے آنے کا انتظار کرتا کہ کب وہ کاغذ کو کورا کر دے گی اور پھر سے میری بانہوں میں آ جائے گی۔

برصغیر کی آزادی قریب تھی جب فاطمہ کی بسم اللہ بسم اللہ نے میرے رام رام کو مات دے دی۔ پہلے پہل وہ مجھ سے نظریں چراتی۔ پھر آنکھ لڑاتی آنکھ مچولی کھیلتی۔ ابھی اُس کی زبان سے الفاظ کا پہلا نغمہ ادا نہ ہوا، مگر اُس کی آنکھیں سُریلے گیت گانے لگیں، لکا چھپی کے اس کھیل میں ہم دونوں گھر سے بہت دور نکل آئے تھے۔ ایک ایسی جگہ جہاں میرا رام نہ پہنچتا تھا۔

یہ خدا کا علاقہ تھا۔ بسم اللہ بسم اللہ کا علاقہ۔ رام جی مجھ سے کھو گئے۔ ہم دونوں گھر کو اور حیدر آباد کو خیر باد کہہ کر کراچی آ بسے تھے، اہلیہ کے کہنے پر میں نے رام جی کی محفل چھوڑی اور ایک خدا تسلیم کیا...... فاطمہ کا خدا...... مسلمانوں کا خُدا...... سنگسار کی ہر چیز کا خدا...... جسموں کی لکیروں میں قید روحوں کا خدا...... معرفت کا مستحق خدا...... دلوں میں بسنے والا خدا...... جو مجھے اپنی گھر والی کی بانہوں میں محسوس ہوتا۔

پاک و ہند کی آزادی کو تقریباً بارہ سال بیت چکے تھے اور ہماری شادی کا آج ساتواں دن تھا۔

رات کے اندھیرے میں لکیروں کے دائروں سے فاطمہ جا چکی تھی۔ دائروں کے حصار سے آزاد ہو چکی تھی۔ مٹی کے پتلے کی مربوط لکیریں تباہ ہو چکی تھیں برباد ہو چکی تھیں بالکل میری طرح...... میری بانہوں میں لاشا تھا...... میرے لیے یہ جاننا مشکل ہو گیا کہ

مردہ کسے کہوں......؟

فاطمہ کو یا خود کو؟

یا اُس ذات کو جو لکیروں سے آزاد ہے، جس نے میری کائنات کا قتل کیا؟ میرے ارمانوں کا گلہ دبا دیا......

اسی کشمکش میں تذبذب بڑھنے لگا۔ موت

کیوں کر آتی ہے اور اُس کا ذمہ دار کون ہو سکتا ہے؟ جواباً دیواریں شور مچاتیں خاموشی آوازوں کا خون کرتی۔ حصار ٹوٹتے روحیں گمنام ہوتیں احساسات بکھرتے...... خدائی اصول لاگو ہوتے۔

خدا کی عدالت میں مدعا پیش کیا جاتا، لیکن فیصلہ تاخیر کے مراحل سے گزرتا جاتا...... مقدمے کی شنوائی بھرپور ہوتی۔ مدعی علیہ کرسیِ صدارت پر بیٹھ کر میری بے بسی ملاحظہ کرتا اور فرشتوں سے بولتا کہ دیکھو...... میرا نائب دیکھو...... انسان دیکھو...... منجھلا روز حاضر ہوتا، فرشتوں کی واہ واہ سنتا اور واپس لوٹ جاتا۔

دن گزرتے گئے...... ایک کے بعد ایک...... ہر روز کی طرح عدالت آج بھی بھری ہوئی تھی کہ کسی نے سرگوشی کی...... عدالت آئے ہو تو عدالت کے اصول جانو! قانون پڑھو! وکیل ڈھونڈو! یہاں جذبات کے اُبال پر شاعر کے مشاعرے سی واہ واہ ہوتی ہے۔ یہ سُن کر میں نے اپنا موقف بدلا۔ فاطمہ کے قتل کا انتقام جیسے جیسے موخر ہوتا گیا دیوانگی بڑھتی گئی۔

میں نے تصویریں بنانا شروع کیں۔ لکیروں سے چہرے تراشتا۔ خدائی فنکاری کی طرح اپنی روح کے احساسات کو لکیروں میں ڈھالتا رنگ برنگوں سے چہرے بناتا جو ایک جگہ اپنا آپ صاف بیان کرتے اور دوسرے سے ملاپ پر اُس میں فنا ہو جاتے۔

دن گزرتے جاتے عدالت کی پیشیاں مظلوم سے خالی رہتیں...... میرے نام کی ہر روز آواز دی جاتی، ہر دن میرے جذبات کا ڈنکا بجتا۔ فرشتے حرفِ سوال دراز کرتے۔ خدا بے عاجز رہتا۔ چھوڑ جانے والی دن بدن میری ذات میں گہری ہوتی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد موت نے اس کائنات کو نگل لیا۔ بچی تو صرف معرفتِ ذاتِ الٰہ...... یا دوسری طرف میں تھا۔

وہ مجھے اُوپر سے دیکھتا اور میں اُسے اُس کے اُوپر سے۔ وہ بُت بناتا، اُن میں روح پھونکتا اور گمنام ہوتا، میں تصویریں بناتا اُس میں بے بس انتقام کے احساسات قید کرتا اور شہرت پاتا۔

وہ مجھ سے چاہتا تھا کہ اُس کے لیے کلائیوں میں چوڑیاں پہن لوں۔ اُس کی چاہت میں ماتم کروں محفل کی داد وصول کروں جس کا شور عالمِ ارواح تک گونج اُٹھے۔ اسی دیوانگی میں بازو چھلنی کرتا، حال بے حال کرتا، خود کو پُرملال کرتا اور جذبات پاتال کرتا۔ اس الہام کی آمد کے بعد خاموشی طاری ہوئی اور پھر......

لکیروں میں قید میرے جذبات کو دُنیا بھر میں پذیرائی عطا ہوئی۔ جن لکیروں کو دیکھ کر عوام الناس اشک بار ہوتے۔ ثابت قدم لغزش پا ہوتے۔ پیمبر پناہ مانگتے۔ عابد قضاء کرتے فرشتے تماشا دیکھتے، جس طرح میں نے فاطمہ کی موت کا تماشا دیکھا۔

قدرتی قانون رَٹ لیے گئے، جس کے سب اصول حاضر تھے سوائے محبت کے۔

کائنات میں اُس کی دھوم تھی، ہر کوئی خدا کے اسمِ اعظم کی تکرار کرتا تھا اور وہ بند کمرے میں چند لکیریں دیکھ رہا تھا کہ

''ٹیڑھی میڑھی لکیروں نے کاغذ کے ایک حصے کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا جس میں کچھ رنگ قید تھے۔ طرح طرح کے رنگ جو ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے، مگر ہر رنگ اپنے حصے میں اپنی ذات صاف بیان کرتا اور دوسرے رنگ سے ملاپ پر اُس میں فنا ہو جاتا۔ ایک حصے پر لکیریں درخت کی شاخوں کی طرح سایہ دار تھیں۔ ان لکیروں میں ایک جگہ ربط بھی تھا، جسے دیکھنے سے احساسات بے ربط ہو جاتے، یہ جگہ اعتبارِ ہیئت کی رُو سے گلاب کے پتوں کی طرح اور دیکھنے والے کے مطابق گلاب کی کلی نظر آتے، یہ دراصل ہونٹ تھے۔ ایک حصہ ایسا بھی تھا جسے دیکھتے ہی سراب کا گماں ہوتا سو جب تک آنکھیں کھلی رہیں گی ہر سو سراب نظر آئے گا۔ اس سراب میں ایک عجیب سی آواز تھی۔ ایک ایسی آواز جس میں گھر کی اپنائیت تھی۔ یہ آنکھیں تھیں......

شاید کوئی انسان تھا۔''

نبیؐ کی نعت ہی سنتے ہوئے بڑا ہوا ہوں
اور اب ثنائے پیمبر میں خود لگا ہوا ہوں
مجھے تو اسم محمدؐ سے یہ صدا آئے
میں ایسا لفظ ہوں جو عرش پہ لکھا ہوا ہوں
حضورؐ! دنیا نے مجھ کو بڑا ستایا ہے
حضورؐ دنیا کے ہاتھوں بہت دکھا ہوا ہوں
جو میری آنکھ سے ٹپکا ہے اشک بولتا ہے
کہ ہجرِ طیبہ میں اک آنکھ سے بہا ہوا ہوں
چراغِ عشقِ پیمبر گواہی دے گا کہ میں
ازل سے ہی دلِ ارسل میں جل چکا ہوا ہوں

ارسلان احمد ارسل/لاہور

دلِ بسمل

صدف زبیری/مسقط

اس نے نفرت آمیز تجسس کے ساتھ خط کھولا ہمیشہ کی طرح آغاز ہوا تھا

تمہیں خط لکھنے بیٹھی ہوں
تمہارا نام کیا لکھوں؟
تمہاری بات دلکش، ذات ریشم
ساتھ شبنم ہے۔۔
تمہاری یاد دستِ عیسیٰ ہے
اور ہجر ظالم ہے۔۔
تمہارا۔۔۔

وحشت کے عالم میں خط کا گولا بنا کر اس نے دیوار پر دے مارا ۔ یہ خط اس کے لئے عذاب بن گئے تھے ہر شے لفظوں کا روپ دھار گئی تھی آفس میں انگلیاں کمپیوٹر کے کی بورڈ پر تھرک رہی ہوتیں تو ترنم تک گنگناتی

تمہارا لمس آتش
آنکھ شعلہ۔۔۔
لب شرارہ ہیں

وہ انہیں تکیے کے نیچے رکھتا تو بستر میں آگ لگ جاتی۔ دراز میں رکھتا تو حرف چلا چلا کر باہر آنے کی منتیں کرنے لگتے۔ جلانا چاہتا تو پہلے خود جلنے لگتا۔ پانی میں بہانے کا سوچتا تو حلق میں پیاس سے کانٹے پڑ جاتے۔ تنہا راتوں میں سمندر کے کنارے نکل جاتا چیخ چیخ کے اس کا گلا بیٹھنے لگتا

کون ہو تم؟
خدا کے لئے سامنے آؤ

وہ اپنا موبائل نمبر دیواروں پر لکھنے لگا ای میل ایڈریس آتے جاتے لوگوں کو بانٹتا۔ رابطے کا کوئی تو راستہ ہو۔ کچھ ایسا جہاں سے پہچان کا کوئی در کھلے۔ خط کا دورانیہ بڑھنے لگتا تو دھیرے دھیرے اسے سکون سا آ جاتا۔ دل ٹھہرنے لگتا۔ وحشت میں کمی آتی تو بیٹھتے چلاتے الفاظ دل پر تھپکی کا کام دینے لگتے۔ کبھی وہ دھیرے سے مسکرا دیتا

اچھا تو تم چھپن چھپائی کھیلنا چاہتی ہو۔ چلو یونہی سہی زندگی تقریباً معمول پر آجاتی کہ پھر ایک دن ڈاکیے کی دستک ہوتی اور وہ تیز ہواؤں کی زد میں اڑتے پتوں کی طرح بکھر جاتا تین سال گذرنے کے باوجود اتنا عادی نہیں ہو پایا تھا ہر بار ڈاکیے کی شکل دیکھتے ہی دبا ہوا ہیجان پھر ابھرنے لگتا۔ رجسٹری کو وصول نہ کرنے کی خواہش کے باوجود دستخط کرتا۔ پھاڑ دینے کے جذبے پر تجسس غالب آجاتا ہر بار پہچان کا کوئی سرا ہاتھ لگنے کی دعا کو وظیفے کی طرح دہراتے ہوئے خط کھولتا تمہاری ذات میرے موسموں کا استعارہ اور۔۔

قامت وہ قیامت ہے
نظر جھکنے نہیں پاتی ۔۔
تمہیں دیکھوں تو سانسوں کا تسلسل
ٹوٹ جاتا ہے
تمہیں سوچوں تو ۔۔
خواہش کا پرندہ پھڑ پھڑاتا ہے

آہ ! جسم میں کانٹے ابھرنے لگتے۔ روح تار تار کھنچی جاتی۔ ننگے پاؤں باہر بھاگتا۔ خط کی پشت پر دیے گئے پتے کی تلاش شروع ہو جاتی۔ ہمیشہ کی طرح کسی کالونی کی آخری سڑک، کسی بلڈنگ کی اختتامی حد، جہاں اس طرح کے کسی گھر کا کوئی وجود نہ ہوتا۔ جاننے کے باوجود وہ ہر بار تلاش میں نکلتا کئی گھنٹوں کی مشقت کے بعد تہی دامانی کا احساس لئے کسی کچی آبادی کے کچے میدان میں یا شہر کی رونق سے ذرا پرے کسی سنسان سڑک کے آغاز پر نامراد پایا جاتا۔ کتنی ہی بار مایوسی کے عالم میں وہ بیچ رستے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا اور زار و قطار رونے لگتا۔ راہ گیر رک کر اسے افسوس بھری نظروں سے دیکھتے۔ پانی پلاتے۔ نرمی اور محبت سے پوچھتے

کوئی کھو گیا ہے ؟

رو لینے سے وہ پرسکون ہو چکا ہوتا۔ غبار نکل جاتا تو دیوانگی شرمندگی میں ڈھلنے لگتی وہ نسبتاً آہستہ سے کہتا

ملتا ہی نہیں۔۔

اور کپڑے جھاڑ کر چل پڑتا۔ پھر خود کلامی کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا آخر اتنی اہمیت ہی کیوں دی جائے۔ محبت بھرے چند لفظ ہی ہیں نا !

پڑے رہیں ایک طرف، سڑتے رہیں میری بلا سے۔۔

خود کو نارمل رکھنے کی پوری کوشش کی جاتی گھر والوں سے مسکرا مسکرا کر باتیں ہوتیں آس پاس موجود ہر نسوانی وجود شک کے دائرے میں آجاتا بھابھی کی خاموش بے رنگ آنکھیں عجیب خجالت میں مبتلا کر دیتیں سعودیہ بھائی کو فون تھماتا بھابھی کو ساتھ لے جانے کے لئے دباؤ ڈالا جاتا۔ منجھلی پھپھو کی سب سے چھوٹی علینا بڑی نٹ کھٹ ہے اس کے شرارتی دماغ سے کچھ بعید نہیں۔ لیکن وہ انگلش میڈیم کی پڑھی تھی اردو میں ایک درخواست تک نہیں لکھ سکتی۔ دو گھر چھوڑ کر رہنے والی عائزہ ایک عرصہ اس کی محبت میں مبتلا رہی تھی لیکن شاپنگ اور میوزک کی دلدادہ کے ہاتھوں میں چوبیس گھنٹے موبائل پایا جاتا پہلے بھی وہ ایس ایم ایس پر ہی اظہار محبت کرتی رہی تھی جب تک اس کا امریکا پلٹ کزن نہیں آیا تھا اس کے بعد اس نے بڑی مہارت سے جان کو بھائی جان میں تبدیل کر دیا تھا۔ کوئی سراغ کہیں سے نہ ملتا تو وہ جھنجلانے لگتا۔ چڑ ایک بار پھر اسے چھیڑنے لگتی۔ کبھی کبھی وہ تھک جاتا تو ٹھنڈی چاندنی راتوں میں کھلے آسمان تلے سر کے نیچے

بازوؤں کا تکیہ بنائے وہ تنہا چاند کو چپ چاپ تکتے جاتا تب ہی وہ خط سے نکل کر دھیرے سے اس کے نزدیک آ کر بیٹھ جاتی۔ نرمی سے اس کے بے چین دل پر ہاتھ رکھ کر سرگوشی میں کہتی:

محبت تختِ دل ہے
اور تم اس کے سکندر رہو
میں اک بہتی ندی ہوں
اور تم ٹھہرے سمندر رہو
تمہیں میں یاد رکھتی ہوں
تو خود کو بھول جاتی ہوں۔۔۔

دل پانی بن کر بہنے لگتا۔ نرم دلگیر روشنی میں آنکھوں کے بھیگے بھیگے گوشے چمک اٹھتے۔ میں تمہیں ڈھونڈ کر رہوں گا۔ وہ اسم اعظم دہراتا۔ تم خدا تو نہیں ہو نا۔ اسی زمین پر اسی شہر کے کسی گھر میں سانس لیتی ہو۔ میں تمہیں ڈھونڈ ہی لوں گا۔ پھر اس نے یکسوئی اور ارتکاز کی مشقیں شروع کر دیں۔ گھنٹوں آسن جمائے بیٹھا رہتا مسلسل مراقبے سے دل میں اور چہرے پر سکون نظر آنے لگا۔ تزکیہ نفس کی ریاضتوں کی وجہ سے وزن تیزی سے گرنے لگا۔ اب ہر خط کے بعد وہ خاموشی سے سجدے میں جا کر گڑگڑانے لگتا۔

بس جیتے جی مجھ پر یہ راز افشاء کر دے

اس کی انا سخت تکلیف میں تھی۔ کوئی تھا جو سالوں سے اس کی توجہ کا مرکز تھا۔ مگر کون؟

یہ کیسی بے بسی تھی خدا کے سوا ہر شے کم از کم حواس کی حد میں ہے۔ تو پھر یہ اب تک حواس سے ماورا کیوں ہے؟

دکھائی نہیں دے سکتی تو سنائی تو دے۔ آہستہ آہستہ اسے سکون آنے لگا دل پر وجدان اترنے لگے مسلسل بھاگ بھاگ کر تھک جانے کے بعد اب وہ نڈھال پڑا تھا۔ پھر اگلے کئی دنوں تک اس کا کوئی خط نہیں آیا سلسلے میں اتنی طوالت پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ پریشانی بے قراری میں بدلنے لگی وحشت اس بار پہلے سے بھی سوا تھی۔

کیا ہوا ہے؟ وہ گھبرایا گھبرایا پھرتا

انتظار نا امیدی میں بدلنے لگا تو کارِ خیر کی کثرت ہو گئی مسجد میں نمازیوں کے جوتے سیدھے ہونے لگے اندھوں کو راستہ دکھاتا بھوکوں کو پکڑ پکڑ کر کھانا کھلایا جانے لگا سامنے والی بیوہ شمیم آنٹی کے تینوں بیٹے پردیس میں تھے وہ نرس کے رحم و کرم پر تھیں ان کی خدمت اور عیادت کو اپنا معمول بنا لیا ہر ایک اسے دعا دیتا اللہ مراد پوری کرے وہ صدقِ دل سے کہتا آمین

مگر مراد کیا تھی؟ پھر اس نے ریکی کی کلاسیں لینا شروع کیں۔ نادیدہ ہستی کا تصور جما کر وہ پیغام بھیجتا

مجھ سے رابطہ کرو

بالآخر اس کی دلی مراد بر آئی۔ لکھا تھا

تو اب دل کی زمینوں پر
تمہارا نام میں لکھوں؟
مجھے بدنام کرنا ہے
تو کیا الزام میں لکھوں؟
پرندوں کے سہارے تم کو
صبح و شام میں بھیجوں
یہی پیغام بھیجا ہے نا کہ
پیغام میں بھیجوں
سو میں خط لکھنے بیٹھی ہوں
تمہارا نام کیا لکھوں

وہ بے حس، ساکت، پھڑپھڑاتے لفظوں کو انگلیوں میں قید کئے بیٹھا رہا۔ یہ کیا تھا؟ وحشت، جنوں، بے قراری، بے چینی سب ختم۔

یہ کون سا احساس تھا جس نے اسے فنا کر دیا تھا۔ تو کیا رابطوں کو رابطوں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

دل بہت آہستگی سے دھیرے دھیرے اندر کی جانب سفر کرنے لگا۔ یہ آغاز تھا تو انجام کیا ہونا تھا۔ ڈوبنے لگو تو خود کو لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دو۔ پہلے وہ بے آواز کمرے میں روتا اور ہر شے اس پر ہنستی تھی ساری دنیا جیسے اس کا مذاق اڑانے پر تُل جاتی تھی اب وہ چپ تھا اور ہر شے رو رہی تھی خط بستر پر رکھا تھا مگر وہاں آگ نہ تھی۔ درازیں اپنے گزشتہ شور و غل پر نادم تھیں طوفان گزر چکا تھا وہ باقیات کو سمیٹ کر بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

آنے والے دن پرسکون اور روشن تھے بھابھی کا ویزا آ چکا تھا وہ ملن کے سپنوں کی گٹھڑی اٹھائے پردیس روانہ ہو گئیں۔ عائزہ امریکا پلٹ کزن کے ساتھ سدھاری۔ شمیم آنٹی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کا گھر چھوٹے چچا نے خرید لیا وہ آجکل اس کی مرمت کا کام کروا رہا تھا آنٹی کے بیٹے رسمی طور پر بمشکل تدفین میں شرکت کے لئے آئے اور گھر کا قضیہ نمٹا کر عجلت میں روانہ ہو گئے وہ کوشش کے باوجود انہیں بوڑھی ماں کے آخری اذیت بھرے دنوں کی داستان سنا کر شرمندہ نہ کر سکا۔ اور اب وہ ان کے گھر میں کھڑا پرانے مکینوں کا سالوں کی محبت اور خوابوں سے جمع کیا سامان کباڑ والے کے حوالے کر رہا تھا۔ تیز ہواؤں نے آنگن میں بے ہنگم شور مچا رکھا تھا تب ہی کباڑیے کے ہاتھ سے ردی سے بھرا لفافہ چھوٹا۔ پاگل ہوا نے پل بھر میں سارے اوراق بکھیر کر رکھ دیے۔ ہوا کے دوش پر رقصاں صفحات اپنی پوشاکیں کھولے پھڑپھڑا رہے تھے۔ کچھ ندامت کی شدت سے بے دم اس کے قدموں میں پڑے تھے اس نے جھک کر دیکھا وہاں کمزور، نحیف ہاتھوں سے زندگی کے آخری لمحوں میں لکھے ہوئے کچھ پورے کچھ ادھورے الفاظ دم توڑ رہے تھے

تمہیں خط لکھنے بیٹھی ہوں۔۔۔
تمہاری آنکھ روتی ہے
مرا دل ڈوب جاتا ہے۔۔۔
تمہارا نام۔۔۔
میری رات کا روشن ستارہ ہے
میرے ہمدم!
محبت تو فقط اک استعارہ ہے۔

محمد اظہار الحق / اسلام آباد

میں اپنی توقیر عشق میں بھولتا کہاں ہوں
میں چاند کے سامنے ستارہ اُجالتا ہوں

میں زندگی اور بخت پانی سے ڈھالتا ہوں
کبھی سفینے کبھی جواہر اچھالتا ہوں
یہ پیاس سے جاں بلب ہیں منکر مرے ہنر کے
میں سنگِ خارا سے آبِ شیریں نکالتا ہوں
میں جا پہنچتا ہوں چاہ سے شاہ کے محل میں
نکل کے زنداں سے میں حکومت سنبھالتا ہوں
زمیں سے اور آسماں سے پانی اور ایک کشتی
میں سینکڑوں سال اس مصیبت کو ٹالتا ہوں
میں اپنی توقیر عشق میں بھولتا کہاں ہوں
میں چاند کے سامنے ستارہ اُجالتا ہوں
تم اپنی اقلیم سے زر و سیم جمع کر لو
میں اپنی گدڑی سے ایک آیت نکالتا ہوں

سنہری نیند سے کس نے مجھے بیدار کر ڈالا
دریچہ کھل رہا تھا خواب میں دیوار کر ڈالا
نشاں ہونٹوں کا لو دینے لگا ہے ذہن میں اب تو
بالآخر میں نے اس کو مشعلِ رُخسار کر ڈالا
نقاہت اور بلا کا حُسن اور آنکھوں کی دلگیری
عجب بیمار تھا جس نے مجھے بیمار کر ڈالا
مرے دل سے لپٹتی زُلف بھی تو دیکھتا کوئی
کبھی نالاں ہیں میں نے شہر کیوں مسمار کر ڈالا
مری اُترن سے اپنی ستر پوشی کر رہا ہے وہ
مرے طرزِ غزل نے کیا اسے نادار کر ڈالا
جو خائف تھے غزل میں ذکر بغداد و بخارا سے
وہ خوش ہوں میں نے اب ذکرِ لب و رُخسار کر ڈالا

ستارے دیکھتا ہوں زائچے بناتا ہوں
میں وہم بیچتا ہوں وسوسے بناتا ہوں
گراں ہے اتنا تو کیوں وقت ہو مجھے درکار
مزے سے بیٹھا ہوا بلبلے بناتا ہوں
مسافروں کا مرے گھر ہجوم رہتا ہے
میں پیاس بانٹتا ہوں آبلے بناتا ہوں
خرید لاتا ہوں پہلے ترے وصال کے خواب
پھر ان سے اپنے لیے رتجگے بناتا ہوں
یہی نہیں کہ زمینیں مری اچھوتی ہیں
میں آسمان بھی اپنے نئے بناتا ہوں
مرے ہنر کی تجھے احتیاج کیا ہوگی
کہ میں زمانے ہی گزرے ہوئے بناتا ہوں

ستارہ ہمارے جہانوں میں تھا
مگر گم کہیں داستانوں میں تھا
چھتوں پر اُترتی تھیں پریاں کبھی
یہ قصہ کئی خاندانوں میں تھا
ہر اک ہونٹ پر بوسۂ مرگ تھا
عجب زہر ساری زبانوں میں تھا
مری شاعری اور میرا معاش
تو گویا یہ چشمہ چٹانوں میں تھا
کتاب اور شمشیر زین اور عصا
بہت کچھ ہمارے مکانوں میں تھا

ثمر بہشت کے تھے حُسن ترکمانوں کا
خوش آ رہا تھا مزہ دوسرے جہانوں کا
زمیں کو علم نہیں کس طرف رواں ہوں میں
حساب سر پہ لیے سات آسمانوں کا
سفید چادرِ غم تھی سفید طائر تھے
سفید صبح کا منظر وہ بادبانوں کا
انہیں خبر ہی نہیں کس طرف مڑوں گا میں
جو کر رہے ہیں تعین مری اُڑانوں کا
کوئی نہیں پسِ دیوار دیکھنے والا
ہجوم مست ہے اظہار خوش گمانوں کا

ثمر پتھر کے ہیں پیڑوں کا سایہ ہی نہیں ہے
تو کیا کوئی پرندہ چہچہایا ہی نہیں ہے
میں ایسا باغ ہوں جس پر کبھی پانی نہ برسا
میں ایسا کھیت ہوں جو لہلہایا ہی نہیں ہے
اُتاری ہم نے سرما کی سنہری دھوپ دل میں
مگر اس سیرگہ میں کوئی آیا ہی نہیں ہے
جبین و چشم اور ماہ و ستارہ سب کو دیکھا
دیا سچ پوچھئے تو کوئی بھایا ہی نہیں ہے
ابھی سے کیوں طنابیں بحر و بر کی کھنچ گئی ہیں
ابھی تو واقعہ میں نے سنایا ہی نہیں ہے
ہزاروں ہیں کبھی تعداد کم ہونے نہیں دی
کہ ہم نے دوستوں کو آزمایا ہی نہیں ہے

بشیر رزمی/لاہور

مجاہدانہ یہاں زندگی گزرتی ہے
ہمارے سامنے میدان کارزار تو ہے

ہماری زندہ دلی حرف حرف خستہ ہے
یہی تو دل کی طرف جانے والا رستہ ہے
کسے خبر کہ ابھی تک ہیں ہم بھی طالب علم
ہمارے شانے پہ لیکن پرانا بستہ ہے
حیات و موت کا قصہ سنا ہے ہم نے بھی
ہمارا ذکر بہرطور جستہ جستہ ہے
اُسے نگاہ میں رکھ کر چلے تو ایسا لگا
اُٹھا ہے راہ میں جو بھی قدم خجستہ ہے
ہمارے دوست ہوئے پختہ مسکنوں کے مکیں
مگر یہ کیا کہ ہمارا مکان خستہ ہے
خلا کے دشت سے باہر نکل کے دیکھتے ہیں
کہ کس طرف کو ہماری زمیں کا رستہ ہے
نکل نہ جائے کہیں یہ ہمارے ہاتھوں سے
ابھی تو گردشِ ایام دست بستہ ہے
نجانے کیسی اُداسی کا دور ہے رزمی
نہ دل شکستہ نہ اپنا بدن شکستہ ہے

ایک انوکھی مری کیمیا ہے
برف نے گرم تر کر دیا ہے
روشنی ہے کہ ممکن ہے یکجا
ایک ہی شہر بھر میں دیا ہے
درد کی لہر آ شوق آ
میں نے ہر زخم دل سی لیا ہے
نیند آنے لگی ہے تمہیں کیوں
وقت کا زہر میں نے پیا ہے
شکر ہے خود کو پہچانتا ہوں
ورنہ ہر کوئی بہروپیا ہے
پھر کسی غیر کو کیوں پکاروں
میں نے اللہ اُسے کہہ لیا ہے
ڈس رہا ہے مجھے گاہے گاہے
میرے پہلو میں سنپولیا ہے
کل تو ہوگا زمیں کا بچھونا
اپنا بستر ابھی بوریا ہے
سامنے اب تو منزل ہے رزمی
سوچنے کیا دیا کیا لیا ہے

ہم تمہارا ہی کہا کرتے رہے
ہر نفس جیتے رہے مرتے رہے
شہر میں پھرتے رہے ساری عمر
اور آنکھوں میں دھواں بھرتے رہے
دیکھ لیتے تھے اُسے مڑ مڑ کر
اپنے سائے ہی سے ہم ڈرتے رہے
بزدلی نے بھی دلیری بخشی
حوصلے دیتے رہے ڈرتے رہے
جس سے روکا تھا ہمیں حیف کہ ہم
عمر بھر کام وہی کرتے رہے
اپنی مٹھی میں رہی وقت کی جان
ہم ترے نام کا دم بھرتے رہے
رشتہ ٹوٹا نہ زمیں سے اپنا
ہم خلاؤں پہ قدم دھرتے رہے
آگ کھاتے ہیں دھواں پیتے ہیں
بس یہی کام سدا کرتے رہے
حد پیری پہ قدم تک رزمی
اپنے بچپن ہی کا دم بھرتے رہے

یہ پتے زرد سہی ان میں کچھ نکھار تو ہے
خزاں کے رنگ میں رنگینیٔ بہار تو ہے
نئی نہیں نہ سہی بات خوش گوار تو ہے
ہماری فکر بصد رنگ تازہ کار تو ہے
مجاہدانہ یہاں زندگی گزرتی ہے
ہمارے سامنے میدان کارزار تو ہے
ہمارے شام وسحر میں اسی سے رونق ہے
قدم قدم پہ کوئی حادثہ دوچار تو ہے
یقین ہے وہ کبھی لوٹ کر نہ آئے گا
مگر یہ دل کہ اِسے اُس کا انتظار تو ہے
نہ اختیار میں شر ہے نہ اختیار میں خیر
سزا، جزا سے کھلا راز، اختیار تو ہے
اگرچہ تخم تمنا اسی سے پھوٹتا ہے
مگر یہ دل ہی تمناؤں کا مزار تو ہے
خوشی نے درد کی چادر لپیٹ رکھی ہے
ہر اک گلاب کے پہلو میں نیش خار تو ہے
کبھی قریب کبھی دور ہو کے بھی رزمی
جہان بھر میں فقط وہ ہی ایک یار تو ہے

گو کہ ہر بار داستان میں ہوں
پھر بھی ناقابل بیان میں ہوں
پوری پڑھ لو تو مجھ کو بتلانا
کہ میں اک اور بھی زبان میں ہوں
اب تو آسیب بن گئی ہوں میں
جب سے ہوں میں، اسی مکان میں ہوں
عکس در عکس بٹ گئی، جیسے
آئینوں کی کسی دوکان میں ہوں
قافلہ گرد باد میں گم ہے
میں بھی شاید کہ کاروان میں ہوں
میرے ملبوس میں جو جھل مل ہے
کچھ ستاروں کے درمیان میں ہوں
تم کسی اور سائے جا بیٹھو
میں کسی اور سائبان میں ہوں

زمانہ ساز ہے، ایسی اساس رکھے گا
وہ گھر سے دور ہے مگر دل کے پاس رکھے گا
وہ داستان کسی اور کو سنائے گا
مرے لیے تو فقط اقتباس رکھے گا
مجھے تو زعم رہیگا کہ ہو گیا سیراب
کسی کے واسطے تھوڑی سی پیاس رکھے گا
اگر بہار کے موسم میں مجھ کو پا نہ سکا
تو بارشوں کے زمانے میں آس رکھے گا
وہ میرے شہر میں آئے گا میرا دل رکھنے
بھرم تو خیر وفا ناشناس رکھے گا
یہ اور بات کہ تنہائیوں میں خوں روئے
بچھڑتے وقت مکمل حواس رکھے گا
مجھے نصیب نہ ہو، وہ مرے قریب تو ہو
یہ کیا ستم کہ مسلسل اُداس رکھے گا

جبیں پہ راستے لکھے ہوئے ہیں
شبوں کے رت جگے لکھے ہوئے ہیں
کوئی پتھر تو ہوگا منزلوں کا
کہ سب پہ فاصلے لکھے ہوئے ہیں
ہماری بے دری مانی ہوئی ہے
سدا کے بے گھرے لکھے ہوئے ہیں
کبھی تو پاؤں میں پازیب ہوگی
ابھی تو دائرے لکھے ہوئے ہیں
مٹا دو گے سبھی پیمان اک دن
یہی جو پے بہ پے لکھے ہوئے ہیں
ہوا کے ہاتھ پر سوچے گئے تھے
ہوا کے سامنے لکھے ہوئے ہیں
فصیل جاں پہ کتنے اسم اعظم
تمہارے واسطے لکھے ہوئے ہیں

نقش پورے، اُٹھان تھی پوری
اس پہ قربان جان تھی پوری
وہ بھی اک شوق کا فسانہ تھا
میں بھی اک داستان تھی پوری
ہم جہاں ساتھ ساتھ چلتے تھے
وہ زمیں آسمان تھی پوری
میں تو جو بھی سوال کر لیتی
زندگی مہربان تھی پوری
وہ کوئی ماہ رخوں کا آقا تھا
شہزادوں سی شان تھی پوری
میں جو نیلم پری سے کم ہی نہیں
مجھ میں بھی آن بان تھی پوری
وہ مرا عمر بھر کا مہماں تھا
اور میں میزبان تھی پوری

اسی چہرے میں پہلے رہ چکی ہوں
یہیں اپنے میں پہلے رہ چکی ہوں
یہ ساری کرچیاں میری پڑی ہیں
کہ آئینے میں پہلے رہ چکی ہوں
جہاں جانا تھا پہلے جا چکی ہوں
یہاں رہنے میں پہلے رہ چکی ہوں
مجھے لگتا ہے، پہلے بھی ملے ہو
میں اس لمحے میں پہلے رہ چکی ہوں
بنفشی پھول پر سوئی ہوئی تھی
ہرے تنکے میں پہلے رہ چکی ہوں
ترے پہلو سے محو رقص نکلی
ترے سینے میں پہلے رہ چکی ہوں
ہوا ہوں، اب دریچوں میں بسوں گی
ترے کمرے میں پہلے رہ چکی ہوں

عنبرین اشعر/فیصل آباد

جانے وہ خود آشنائی تھی یا تجھ کو جاننا
اک ادھورا کام تھا جو عمر بھر کرتے رہے

بے جہت بے آسرا ساکت سفر کرتے رہے
کوئے جاں کے سنگ ریزوں کو گہر کرتے رہے
بے صدا بے نقش آہٹ دستکیں دیتی رہی
ہم پسِ دیوار خود کو بے خبر کرتے رہے
جانے کیسی تشنگی تھی کم نہ ہو پائی کبھی
زندگی شبنم کے قطروں میں بسر کرتے رہے
وہ تو سحر آرزو تھا اک تمنا کا طلسم
بے سبب اپنی اُداسیوں بے اثر کرتے رہے
آس کی ہر بوند میں تحلیل ہوتے فاصلے
بے کراں انت چنوں کو مختصر کرتے رہے
جانے وہ خود آشنائی تھی یا تجھ کو جاننا
اک ادھورا کام تھا جو عمر بھر کرتے رہے
روشنی کے سارے رنگوں میں چھلکتا ہے وہ رنگ
اک اسی نامعتبر کو معتبر کرتے رہے

ڈوبتا اندھیرا تھا اور کچھ ستارے تھے
اب سحر کے ہونے تک بس یہی سہارے تھے
اطمینان یہ ہے کہ کچھ کمک نہیں مانگی
اپنی جنگ میں ہم نے اپنے خواب تارے تھے
جس قدر ضرورت تھی لے لیا نگاہوں نے
یوں بھی وہ سبھی منظر کب فقط ہمارے تھے
نکہتوں کی خواہش نے دربدر کیا اس کو
ہم کو گل زمینوں کے سارے رنگ پیارے تھے
رہ کے سنگریزوں سے دھڑکنوں کی چوکھٹ تک
کچھ دبی صدائیں تھیں آہٹوں کے دھارے تھے

اب بھی وہ مناظر ہیں نقش میری آنکھوں پہ
آگ میں تھے چھپے اور آگ میں شرارے تھے
ساحلوں نے پل بھر میں روپ اس طرح بدلا
ہر طرف سمندر تھا بیچ میں کنارے تھے
جان بوجھ کر ہم نے فاصلے بڑھائے یوں
کتنے جان لیوا وہ زیست کے اشارے تھے

سرد جھونکے بجھا رہے ہیں مجھے
گرم سائے جلا رہے ہیں مجھے
زندگی ہے کہ ڈگ نہیں بھرتی
تیز لمحے ہٹا رہے ہیں مجھے
لوگ بے سمت قافلوں کی طرح
چل رہے ہیں چلا رہے ہیں مجھے
پھر وہی لفظ آئنے بن کر
میری صورت دکھا رہے ہیں مجھے
میں خس و خاک گر نہیں تو بتا
کیوں بگولے اُڑا رہے ہیں مجھے
وہ بھنور جو عذاب تھے میرا
اب کنارے لگا رہے ہیں مجھے
ان سے بڑھ کر تو بے خبر میں نہیں
لوگ یہ کیا بتا رہے ہیں مجھے
آنکھ میں منجمد ہیں جو ساگر
اک جنم سے جلا رہے ہیں مجھے
اپنی تعبیر اپنے پاس رکھو
میرے سپنے بلا رہے ہیں مجھے

کس کا رستہ دیکھتی ہے بے ثمر پیڑوں کی چھاؤں
رات بھر کو جاگتی ہے بے ثمر پیڑوں کی چھاؤں
اوڑھتی ہے پیلی کرنیں بے بسی کے دور میں
بارشوں میں بھیگتی ہے بے ثمر پیڑوں کی چھاؤں
اس قدر بھائی ہے اس کو بے طرح بے مائیگی
اب نہ کچھ بھی مانگتی ہے بے ثمر پیڑوں کی چھاؤں
حسرتوں کی بند گلیوں میں کبھی بھٹکی نہیں
راکھ بن کر جھومتی ہے بے ثمر پیڑوں کی چھاؤں
خلوتوں میں ممتا کی داستانیں سینچتی
جلوتوں سے بھاگتی ہے بے ثمر پیڑوں کی چھاؤں
جو بچھڑتے جا رہے ہوں ان کے قدموں میں گری
آہٹوں کو روکتی ہے بے ثمر پیڑوں کی چھاؤں

کوئی ایسا نگر تسخیر کرنا
جسے خوشیوں سے ہو تعبیر کرنا
اسے کھونے کو اک رشتہ نہ دینا
کوئی جیون اگر تحریر کرنا
پلٹ جائیں گے دستک دینے والے
خدارا در کو نہ زنجیر کرنا
غموں کی گرد کو پہلے ہٹانا
مری صورت کو جو تصویر کرنا
یہ اُلفت تاج محلوں سے جدا ہے
مرے اندر اسے تعمیر کرنا
بچانا وار اپنی اس نظر سے
نیامِ چشم سے شمشیر کرنا

ناز اوکاڑوی/اوکاڑہ

بس اتنی دشواری ہے آنسو آنکھ سے بھاری ہے

ظفر اقبال جو کہ ادبی دنیا میں ناز اوکاڑوی کے نام سے شہرت رکھتے ہیں۔ گزشتہ تیس برس سے شعر و ادب سے وابستہ ہیں۔ وہ کالم نویس، شاعر، افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ ابتدائی تعلیم اوکاڑہ سے حاصل کی بعد میں بسلسلہ روزگار کویت چلے گئے۔ وہاں طویل عرصہ قیام کے دوران ادبی محافل میں گاہے بگاہے شریک ہوتے رہے۔ اب مستقل طور پر پاکستان آگئے ہیں۔ ناز اوکاڑوی کی شاعری سادہ اور سچے جذبوں کی ترجمان ہے اُن کی شخصیت کی طرح اُن کی شاعری بھی صاف، شفاف اور اجلی ہے۔ وہ شعر کہتے ہوئے نہ تو خود اُلجھتے ہیں اور نہ ہی قاری کو اُلجھاتے ہیں بلکہ سادہ اور سیدھا شعر کہتے ہیں۔ اُن کا پنجابی شعری مجموعہ ''ڈونگھے پانی'' کے نام سے شائع رہا ہے۔

کشتی پار لگانی ہے
کتنا گہرا پانی ہے
کوئی سننے والا نہیں
میرے پاس کہانی ہے
مدت بعد نکل آئے
اشکوں پر حیرانی ہے
گھر گھر شادی کا میلہ
گھر نوحہ خوانی ہے
ڈوب رہی ہے اک دُنیا
یہ کیسی طغیانی ہے
میرے اندر کا موسم
اور بھی کچھ طوفانی ہے
ناز محبت کیسے ہو
یہ دُنیا تو فانی ہے

خود میں ہوتا تھا ٹھکانہ اپنا
کتنا اچھا تھا زمانہ اپنا
آج کے دور میں اتنا بھی بہت
ہے میسر ہمیں شانہ اپنا
قیس و فرہاد سے نسبت ہے ہمیں
دشت و کہسار ٹھکانہ اپنا
اشک خود میں ہی چھپا رکھے ہیں
کون دیکھے گا خزانہ اپنا
کوئی خطرہ نہیں دُشمن سے ہمیں
ہم تو ہوتے ہیں نشانہ اپنا
ہم دکھائیں تو کسی کو کیسے
ہو گیا خواب پرانا اپنا
شہر میں لوگ بہت ہیں لیکن
ہاں کوئی دوست رہا نہ اپنا
درد جیسا بھی ملے ناز تمھیں
کوئی آنسو نہ گرانا اپنا

دل فگاروں کی بات کرتے ہو
غم کے ماروں کی بات کرتے ہو
جو میری دسترس سے باہر ہیں
ان ستاروں کی بات کرتے ہو
جن سے دامن جلا لیا اپنا
ان انگاروں کی بات کرتے ہو
اپنے ڈوبے جہاں سفینے بھی
ان کناروں کی بات کرتے ہو
وہ جہاں سے ہمیں نکالا گیا
ان دیاروں کی بات کرتے ہو
ناز ہم کو ملا نہیں کوئی
تم ہزاروں کی بات کرتے ہو

یارو اتنا خیال رکھنا
اب کہ گتھے سنبھال رکھنا
نسل نو کے لیے جہاں میں
رونقیں تم بحال رکھنا
ان اندھیروں سے ہے گزرنا
چند جگنو بھی پال رکھنا
دل میں اپنے عدو کی خاطر
شیشے میں تم نہ بال رکھنا
خواہشیں دلفریب جنگل
خود کو ان سے نکال رکھنا
نام مرشد کا لے کے ہر دم
ناز مشکل کو ٹال رکھنا

بس اتنی دشواری ہے
آنسو آنکھ سے بھاری ہے
اُس کو کیسے الگ کر لوں
وہ تو مجھ میں جاری ہے
ویسے تو ہے عام سا شخص
میری دُنیا ساری ہے
پیار کو اس پر پیار آئے
وہ تو اتنی پیاری ہے
دن کو چین نہ رات کو چین
یہ کیسی بیماری ہے
کھیل زمانہ کھیل چکا
اب تو ناز کی باری ہے

ارشد سعید/ آسٹریلیا

دشمنوں پر وا کرنا ہم کو آتا ہے مگر
دوست ہی جب ہوں عدو تو سامنا کیسے کریں

ارشد سعید کا یہ پہلا شعری مجموعہ ہے۔ وہ نو جوان نہیں لیکن جوان ضرور ہے۔ وطن سے ہزاروں کوس دور، بحرالکاہل کے کنارے وہ اُس ساحر کی طرح بیٹھا ہے جس کی بند ٹوکری میں بہت کچھ پڑا ہے لیکن ابھی اُس نے اُس میں سے کم حیرتیں دکھائی ہیں۔ اس کے آنے والے مجموعوں کا انتظار کرنا چاہیے۔ میں یہ انتظار بے تابی سے کر رہا ہوں اس لیے کہ اس کی بند ٹوکری میں جو کچھ بھی ہے، کہیں اور نظر نہیں آئے گا۔ (اظہار الحق)

حسیں گلشن میں شاخوں کی نزاکت یاد رہتی ہے
کہ جیسے پھول چہروں کی صباحت یاد رہتی ہے
نئی تخلیق ہوتی ہے نئے افکار سے پہلے
پھر اُس کے بعد کاغذ پر طباعت یاد رہتی ہے
میں اکثر احتراماً سر جھکا کر بیٹھ جاتا ہوں
اذانوں کی مجھے جب بھی فصاحت یاد رہتی ہے
جو اپنی زندگی کو دوسروں کے نام کرتے ہیں
ہمیں ایسے ہی چہروں کی شرافت یاد رہتی ہے
ہمارے پھول سچے جو کبھی ہم سے لپٹتے ہیں
تو ہم کو اپنے گلشن کی ملاحت یاد رہتی ہے
متاعِ جاں سے ارشد جو دلوں میں گھر بناتے ہیں
ہمیں ایسے رفیقوں کی رفاقت یاد رہتی ہے

جو دیکھنے میں مجھ کو بھلا سا لگتا ہے
وہ آئنہ میں کوئی دوسرا سا لگتا ہے
اُداسی میری منڈیروں پہ آ کے بیٹھ گئی
فلک کا چاند بھی اب خوشنما سا لگتا ہے
عجیب کرب زدہ خد و خال ہیں اس کے
کہ جب بھی دیکھوں وہ مجھ کو تھکا سا لگتا ہے
وہ خوبرو بھی ہے رہتا الگ تھلگ خود سے
کوئی کہے نہ ہے وہ جدا سے لگتا ہے
فلک مزاج کوئی ایہ ہے یہاں جس سے
زمیں کی بات کریں تو برا سا لگتا ہے

مری تمام محبت ہے اُس کے نام ارشد
جو شہر بھر میں مجھے باوفا سے لگتا ہے

اس وحشتِ ہوا سے جو اتنا اُداس ہوں
میں اے خیالِ یار! دریدہ لباس ہوں
پتھر دکھا رہے ہو مجھے کس لیے میاں!
سب کچھ مجھے پتہ ہے میں گوہر شناس ہوں
خوشبو نہیں کہ دور ہواؤں سے جاؤں میں
محسوس کر کے دیکھ ترے آس پاس ہوں
تو آگہی کے شوق میں مجھ سے جدا نہ ہو
اے حسنِ یار میں بھی تو تیرا قیاس ہوں
ارشد تلاشِ یار میں کیسا یہ حال ہے
بارش میں رہ کے بھی کسی صحرا کی پیاس ہوں

کر لے نمازِ شوق ادا اور لہو میں آ
اے دوست! تو بھی اب مرے جذبِ نمو میں آ
زندانِ عشق آج سرورِ وفا میں ہیں
ہمراو یار محفلِ جام و سبو میں آ
تجھ پر بہار آئی ہوئی ہے تو اب کی بار
بن کر گلاب ملنے مجھے رنگ و بو میں آ
لپٹی ہوئی ہے کس لیے رنگِ ملال میں
اے شامِ خامشی تو مری ہاؤ ہو میں آ

اندر کی خامشی تو مجھے مار ہی نہ دے
اے دوست! صبح و شام مری گفتگو میں آ
ارشد فراقِ یار روانی میں کم نہ ہو
اے موجِ اشک تو بھی مری آب جو میں آ

چاند تارے توڑ کر خود کو بڑا کیسے کریں
ہم اُجالوں کے لیے یہ سانحہ کیسے کریں
کانچ کے ہم گھر بنائیں اور سجائیں خواب پھر
پتھروں کے شہر میں یہ حوصلہ کیسے کریں
اس لیے رُوٹھے ہوئے بیٹھے ہیں اپنے آپ سے
دل خفا ہو یار سے تو رابطہ کیسے کریں
اس زمیں کے عکس پر بھی چاند جیسا داغ ہے
کیسے ہم اُس کو مٹائیں خوش نما کیسے کریں
دشمنوں پر وار کرنا ہم کو آتا ہے مگر
دوست ہی جب ہوں عدو تو سامنا کیسے کریں
مدتوں کے بعد ملنے آ گیا ارشد کوئی
اے طلسمِ خواب تجھ کو دل رُبا کیسے کریں

دل کی دنیا میں بھی تسکین کہاں پاتے ہیں
غم بھی آتے ہیں، ٹھہرتے ہیں، گزر جاتے ہیں
میرے مولا نے مجھے رزق دیا ہے اتنا
روز پنچھی مرے آنگن میں اُتر آتے ہیں

افتخار شوکت/لاہور

کمروں میں لوگ پیاس سے چپ چاپ مر گئے
دیوار و در کے ساتھ ہی دریا لگا رہا

افتخار شوکت گزشتہ 25 برس سے شعروادب سے وابستہ ہیں۔ ان کا تعلق ساہیوال سے ہے لیکن اب مستقل طور پر لاہور آچکے ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے قانون دان ہیں۔ اس سے قبل وہ ایک مقامی مالیاتی ادارے میں بھی کام کر چکے ہیں۔ ان کے مرتب کردہ شاعری کے دو انتخاب شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا انتخاب "خوشبو تیرے نام" پاکستان کی گولڈن جوبلی سالگرہ پر منظر عام پر آیا جس میں قیام پاکستان سے لے کر پچاس سال کی شاعری کا انتخاب تھا۔ دوسرا انتخاب "غزلیں تیری آنکھوں جیسی" کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں جدید شعرا کا کلام شامل ہے۔ افتخار شوکت خود بھی جدید غزل کے نمائندہ شاعر ہیں اور متعدد آل پاکستان مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ ان کے پہلے شعری مجموعے کا قارئین کو شدت سے انتظار ہے۔ (ارژنگ)

دل کو ہر ایک گام پہ دھڑکا لگا رہا
تا عمر پیچھے جس طرح سایا لگا رہا
پاؤں لگے ہوئے تھے کسی راستے کے ساتھ
پاؤں کے ساتھ یا کوئی رستہ لگا رہا
جیسے مرے وجود سے چلتی ہے کائنات
مجھ کو تمام عمر ہی دھوکا لگا رہا
میں لڑکھڑا کے گرتا رہا بن پیے یونہی
مجھ کو کسی کی آنکھ کا نشہ لگا رہا
فرصت نہیں تھی لوگوں کو رقص و سرود سے
میں شہر کو بچانے میں تنہا لگا رہا
شوکت میں اُس کے ساتھ بھی تھا اپنے ساتھ بھی
تا عمر یہ عجیب تماشا لگا رہا
کمروں میں لوگ پیاس سے چپ چاپ مر گئے
دیوار و در کے ساتھ ہی دریا لگا رہا

میری تلاش میں اُسے آنا تو ہے نہیں
آنسو ہیں مجھ میں کوئی خزانہ تو ہے نہیں
دریا ہو سامنے کہ سمندر ہو سامنے
اس بار ہم نے خود کو بچانا تو ہے نہیں
دشمن ہو یا کہ دوست برابر ہے راہ میں
یہ قابل بھروسہ زمانہ تو ہے نہیں
رکھا جہاں بھی سر وہاں پتھر ملا ہمیں
یہ زندگی ہے آپ کا شانہ تو ہے نہیں
اس کی نمود ہوگی تمہارے وجود میں
یہ دل کہیں پہ اور لگانا تو ہے نہیں
مشکل میں اپنا آپ ہی بن جاؤں دوست میں
مجھ کو کسی نے دوست بنانا تو ہے نہیں
کوئی ضرور آئے گا ان کو خریدنے
میرا کوئی بھی خواب پرانا تو ہے نہیں
دینے پڑیں گے اُس کو دل و جان افتخار
اس بار میرے پاس بہانہ تو ہے نہیں

نیم شب جب وہ کمرے میں آئے
چاند اُس کے دریچے میں آئے
وہ کسی اور کا مقدر تھا
ہم کسی اور کے حصے میں آئے
پیار مجھ سے شدید ہے شاید
جس بھی آئے وہ غصے میں آئے
ہم چکا دیں گے سب حساب کتاب
گر کسی روز نشے میں آئے
جب کلائی میں اُس نے پہنا تو
رنگ کچھ اور گجرے میں آئے
اُس کو پوری غزل بنا دوں میں
صرف اک بار مصرعے میں آئے
وہ کبھی آئے پھول میں شوکت
اور کسی وقت جھونکے میں آئے

چاند آدھا رہ گیا تھا رات آدھی رہ گئی
بیٹھے بیٹھے کھو گئے ہم بات آدھی رہ گئی
وہ جدھر اُٹھ کر گیا یہ اُس ہی رُخ پر چل پڑے
چند پل میں تاروں کی بارات آدھی رہ گئی
بے سبب مصروفیت نے اس طرح کھایا مجھے
ایسے لگتا ہے کہ میری ذات آدھی رہ گئی
بات وہ کرتا نہیں تو ایسے لگتا ہے مجھے
ہر خوشی جس طرح میرے ساتھ آدھی رہ گئی
وقت کی آندھی اُڑا کر لے گئی کیا کیا نقوش
زندگی کی تتلی میرے ہاتھ آدھی رہ گئی
ٹھیک سے اُس نے مری جانب کبھی دیکھا نہیں
میری تو ہر بار ہی خیرات آدھی رہ گئی
صلح کر لی ہم نے اک اور ڈر سے افتخار
جیت آدھی رہ گئی اور مات آدھی رہ گئی

وحید قندیلؔ/آسٹریلیا

یہ تو سب مانتے ہیں شکل حسیں ہے اُس کی
آنکھ نیلم ہے آئینہ جبیں ہے اُس کی

وہ پھول بھی ہے وہ شبنم بھی ماہ جبین بھی ہے
بتاؤ شہر میں ایسا کوئی حسین بھی ہے
وجود اُس کا ہے مہتاب و چاند کی صورت
فلک کا نور بھی ہے جلوۂ زمین بھی ہے
سنا ہے پیار بہت تتلیوں سے ہے اُس کو
وہ دشت گرد بھی ہے باغ کا مکین بھی ہے
نہ کیوں ہو پیار مجھے خار و گل و گلشن سے
وہ گل کا دوست بھی کانٹوں کا ہمنشین بھی ہے
تصرف اُس کو زمیں آسماں پہ حاصل ہے
مکیں زمین کا ہے، وہ فلک نشین بھی ہے
چلو کہ دیکھیں ذرا اُس پری شمائل کو
وہ اپنے حُسن میں کیا قابلِ یقین بھی ہے
میں ترک کر نہیں سکتا ہوں عشق کو قندیلؔ
یہ عشق میرا دھرم بھی ہے اور دین بھی ہے

کب تک ہم اپنے آپ سے یوں گفتگو کریں
اے کاش دل کی بات ترے روبرو کریں
اس شہر میں اذاں کے بلاوے کے بن ہی لوگ
جنت نصیب ہیں جو نماز و وضو کریں
جام و شباب و ڈالر و دینار کی جگہ
مسجد تلاش راہ بہ راہ کو بہ کو کریں
عورت نہیں یہاں پہ جہنم کی آگ ہے
اُن کے وصال کی نہ کبھی آرزو کریں
کھائیں کمائیں خوب یہاں، دل ہو دیس میں
اُس کو سنوارنے کی تڑپ، آرزو کریں
محفل میں بات اپنے علاقے وطن کی ہو
آنکھیں چمک رہی ہوں جو یہ گفتگو کریں
قسمت میں اُن کی صرف پشیمانیاں قندیلؔ
جو مغربی گلوں کے لیے دل لہو کریں

قوسِ قزح کے روپ میں اک یار مل گیا
مجھ کو مرے خیال کا شاہکار مل گیا
میں نے ہر ایک چیز کو دل سے بھلا دیا
جب سے بُتِ حسین کا ہے پیار مل گیا
خوش بخت ہے وہ شخص بڑا خوش نصیب ہے
جس کو جہاں میں عشق کا آزار مل گیا
وہ بن سنور کے جب سرِ بازار آ گیا
کوئی نہ کوئی اُس کو خریدار مل گیا
تتلی نے یہ گلاب پہ پھیلائے تو کہا
اچھا ہوا کہ مجھ کو مرا یار مل گیا
دھو بیٹھے اپنی جاں سے ہم ہاتھ عشق میں
اُن کو ہمارے خون سے سنگار مل گیا
قندیلؔ مدتوں سے جسے ڈھونڈتا تھا میں
گوشے میں دل کے مجھ کو وہ دلدار مل گیا

یہ تو سب مانتے ہیں شکل حسیں ہے اُس کی
آنکھ نیلم کی ہے آئینہ جبیں ہے اُس کی
زندگی میری جہنم کی طرح اُس کے بغیر
کون کہتا ہے ضرورت بھی نہیں ہے اُس کی
پوری ہو جائے گی لگتا ہے مجھے دل کی مُراد
کہ دعا میری ہے اس بار امیں ہے اُس کی
خُلق ہی ایسا دیا میرے خدا نے اُس کو
وہ جہاں بیٹھے پذیرائی وہیں ہے اُس کی
بن سنور کے وہ جہاں بھی چلا جائے قندیلؔ
پھول اُس کے ہیں وہاں کے تو زمیں ہے اُس کی

آ کر مرے قریب وہ دل میں سما گیا
سارا سکون و چین وہ میرا چرا گیا
ڈھل کر وہ دھڑکنوں میں دلِ بے قرار کی
مجھ کو وہ شوخ اپنا دیوانہ بنا گیا
مجھ کو دکھائی دینے لگے جس میں اپنے داغ
کچھ ایسا آئینہ ہے وہ مجھ کو دکھا گیا
خوابوں میں آ رہا ہے وہ بن کے بہارِ حسن
یادوں پہ وہ اُمیدِ وفا بن کے چھا گیا
میں اُس کے پاس جا نہ سکا پاؤں شل میرے
وہ تھا کریم آپ میرے پاس آ گیا
قندیلؔ اُس کا شکر بجا لا تو روز و شب
جو تیرے دل میں شمعِ محبت جلا گیا

داغِ دل سے اپنی راتوں کو چراغاں کیجیے
ظلمتوں کا دور ہے شمعیں فروزاں کیجیے
اُڑ گئی ہے ہاتھ سے تتلی تو کوئی غم نہیں
ہاتھ سے نکلی ہوئی شے کا نہ ارماں کیجیے
جنسِ نادیدہ کا شوق ہوتا ہے ہر انسان کو
اپنے چہرے کو سرِ محفل نہ عریاں کیجیے
بدلیاں پھر آ رہی ہیں یادِ ساون کی مجھے
اپنے کندھوں پہ ذرا زُلفیں پریشاں کیجیے
لطف ملنے کا بہت ہی ہو رہا ہے اس گھڑی
اتنی جلدی لوٹنے کی ضد نہ مہماں کیجیے
تم جو جاتے ہو اجازت ہے خدا حافظ مگر
پھر کوئی قبلِ وداع ملنے کا پیماں کیجیے
شاعری میں خود کو جب قندیلؔ کہلاتا ہے تو
اب ذرا خود کو جلانے کا بھی ساماں کیجیے

عالمی اُردو شاعری

(ترتیب بہ لحاظ حروفِ تہجی)

دل و دماغ میں تکرار ہو نہ جائے کہیں
ترے وجود سے انکار ہو نہ جائے کہیں
میں ایک اور جنم اب کہاں سے لاؤں گا
وہ شخص پھر مجھے درکار ہو نہ جائے کہیں
مخالفوں کو یہی ایک فکر لاحق ہے
یہ قوم نیند سے بیدار ہو نہ جائے کہیں
مرے خیال میں ہر دم جو محو رہتا ہے
مرے ہی نام سے بے زار ہو نہ جائے کہیں
مرے پڑوس کی دیوار گرنے والی ہے
مرا مکان بھی مسمار ہو نہ جائے کہیں
اسی لیے تو میں اکثر خموش رہتا ہوں
مرے ملال کا اظہار ہو نہ جائے کہیں
متاعِ درد کو دل سے نکال مت آصف
یہ جسم اور بھی بے کار ہو نہ جائے کہیں

آصف شفیع/سعودی عرب

اب یوں متاعِ درد کو کھونا تو ہے نہیں
کرنا ہے ضبط ہجر میں رونا تو ہے نہیں
اب دل کے داغ سب کو دکھاؤں تو کس لیے
آ کر کسی نے بوجھ یہ ڈھونا تو ہے نہیں
اب اس سے کھیلنے کی اجازت نہیں تمھیں
دل ہے مرا یہ کوئی کھلونا تو ہے نہیں
ترکِ تعلقات کی کوشش فضول ہے
صاحب! یہ کام آپ سے ہونا تو ہے نہیں
بہتر ہے اُس کی یاد سے کر لوں مکالمہ
ویسے بھی رات بھر مجھے سونا تو ہے نہیں
یونہی کسی کی یاد میں رونے سے فائدہ
اشکوں نے دل کے داغ کو دھونا تو ہے نہیں
اُس بے وفا کی چھوڑ کوئی اور بات کر
ارشد یہ ایک رات کا رونا تو ہے نہیں

ارشد شاہین/ناروے

ہم جیسے ہیں ہم کو ویسا رہنے دو
تنہا ہیں تو ہم کو تنہا رہنے دو
ایک ادھورا خواب مرا سرمایہ ہے
پاس مرے تم یہ سرمایہ رہنے دو
پنچھی ورنہ پیاسے ہی مر جائیں گے
میں جنگل ہوں مجھ میں دریا بہنے دو
دیکھو میری شان بڑھا کر کم نہ کرو
میں ہوں جتنا مجھ کو اتنا رہنے دو
میں تو ازل سے ہی بیمارِ اُلفت ہوں
مت چھیڑو تم درد کا قصہ رہنے دو
میری یاد سے دل آباد کیے رکھو
مجھ کو اپنی ذات کا حصہ رہنے دو
چاہے بہار آ جائے پھر بھی اے ساحلؔ
پاکٹ بک میں سوکھا پتہ رہنے دو

ارشد نذیر ساحلؔ/اسپین

پلٹنا پڑ گیا تنہا پرندے اُڑ گئے تھے
میں جب اس شہر میں پہنچا پرندے اُڑ گئے تھے
منڈیریں بازوؤں سے لگ کے رونے لگ گئی تھیں
لگا اتنا مجھے عرصہ پرندے اُڑ گئے تھے
نظر آیا نہ کچھ جس وقت اس کوئیں میں جھانکا
پھر اس نے بام پر دیکھا پرندے اُڑ گئے تھے
جگہ کوئی نہ چھوڑی ڈھونڈنے میں کائناتیں
نہ جانے کیا ہوا ہر جا پرندے اُڑ گئے تھے
شجر ندی ترا آنچل مرا گلیوں میں چلنا
وہیں پر رہ گیا جو تھا پرندے اُڑ گئے تھے
مکاں اندر سے باہر سے صدائیں دے رہا تھا
عجب اک شور تھا برپا پرندے اُڑ گئے تھے
نوید آتے ہوئے دیکھا تھا سب نے پھر نہ جانے
ہوا کس کی طرف در وا، پرندے اُڑ گئے تھے

افضال نوید/کینیڈا

شمعِ نور کو تم میرے حوالے کر دو
اک نظر سے میری دنیا میں اُجالے کر دو
پوچھ ہی بیٹھو ہو گر میری فرمائش
جاؤ بازار سے تھوڑی سی وفا لے کر دو
بند کر ڈالو رواجوں سے بھی روزنِ جاں
اور درِ دل پہ روایات کے تالے کر دو
گھر مجھے چاہیے جو میری پناہ گاہ بنے
اُنگلیاں جس پہ نہ اُٹھیں وہ ردا لے کر دو
جستجو! کھیل کے تم خون کی ہولی یک دم
جگمگاتے ہوئے منظر بھی کالے کر دو
ایک عرصے سے تبسم نے لکھا ہے جن کو
ایک پل میں اُنہی نغمات کو نالے کر دو

تبسم انور/کینیڈا

ہونے کو تو دُنیا میں کیا ہو نہیں سکتا
بس میں تری اور تو ہی مرا ہو نہیں سکتا
تن سے مرے واقف ہو مگر روح سے انجان
یہ پیار تمہارا تو کھرا ہو نہیں سکتا

عالمی اُردو شاعری

(ترتیب بہ لحاظ حروفِ تہجی)

دشمن کو مرے تم نے لگایا ہے گلے سے
کیا اب بھی مجھے تم سے گلہ ہو نہیں سکتا
آ جائے جو عیسیٰ بھی مسیحائی کو میری
ایسا ہے مرا زخم بھلا ہو نہیں سکتا
یہ سچ ہے کہ تجھ میں ہے کوئی بات الگ سی
یہ دل مرا ایسے تو ترا ہو نہیں سکتا
اب شام و سحر ہم تو سدا ساتھ رہیں گے
گر عشق ہو سچا تو فنا ہو نہیں سکتا

سیمہ سحر/یو کے

کوئی دیا ہوا کو بجھانے نہ دوں کبھی
ظلمت کو اپنا راج چلانے نہ دوں کبھی
ان بجلیوں کو روک رکھوں آسماں پہ
ان آندھیوں کو پیڑ گرانے نہ دوں کبھی
جو لوگ اچھے ہیں وہ رہیں میرے آس پاس
جو میرے بس میں ہو انھیں جانے نہ دوں کبھی
اتنا خیال رکھوں میں اپنی زمین کا
دل اس کا آسماں کو دکھانے نہ دوں کبھی
ننھے دلوں کو ڈر سے بچاؤں کس طرح
پیڑوں کو پنچھیوں سے اُڑانے نہ دوں کبھی
فطرت کے ساتھ جوڑ دوں میں سب کو سعدیہ
کاغذ کے پھول گھر میں سجانے نہ دوں کبھی

سعدیہ سیٹھی/انگلینڈ

وہ آنکھوں میں اُتر کر دیکھتا ہے
سمندر سے سمندر دیکھتا ہے
سجے رنگوں سے منظر دیکھتا ہے
مجھے جب وہ برابر دیکھتا ہے
سرِ محفل ہے اُس کا دیکھنا یوں
نہیں وہ دیکھتا پر دیکھتا ہے
کمی ہوتی ہے کوئی گھر کے اندر
وگرنہ کون باہر دیکھتا ہے
تجلی دیکھتی ہے کب پیمبر
تجلی کو پیمبر دیکھتا ہے
یہاں رُک جاتی ہیں نظریں بدن پر
کوئی کب دل کے اندر دیکھتا ہے
دیا بھی لو بڑھا دیتا ہے اپنی
ہوا کے جب یہ تیور دیکھتا ہے
ترے دستِ کشادہ کا ہنر ہے
تجھے اب تک گداگر دیکھتا ہے
مرا صیاد پنجرے میں فقط اب
مرے ٹوٹے ہوئے پر دیکھتا ہے

شازیہ نورین/جرمنی

فقط دلدوز چیخیں اور صدائیں چھوڑ جاتی ہیں
اجل آ جائے تو بچوں کو مائیں چھوڑ جاتی ہیں
کبھی کوئی شگفتہ پھول آنگن میں نہیں آیا
ہمیشہ خشک پتے ہی ہوائیں چھوڑ جاتی ہیں
ذرا سی دیر کو موسم سہانا ہوتا ہے اور بس
فلک پیاسا، زمیں پیاسی گھٹائیں چھوڑ جاتی ہیں
سمندر کیا وگرنہ قطرہ ہی مجھ کو ڈبو دیتا
کنارے تک تو پیارے کی دُعائیں چھوڑ جاتی ہیں
مجھے اس گھر میں رہنا پڑ رہا ہے صائمہ کب سے
جسے وحشت سے گھبرا کر بلائیں چھوڑ جاتی ہیں

صائمہ ملک/سپین

تری آنکھ میں خود کو ہم دیکھتے ہیں
بصد شوق تجھ کو صنم دیکھتے ہیں
کبھی موج ہے تو کبھی فاقہ مستی
کہ ساتھ ہر خوشی کے الم دیکھتے ہیں
زمانے نے بھڑکائی نفرت کچھ ایسی
محبت کو اب لوگ کم دیکھتے ہیں
نہیں حل جو پاتے سچائی کے پیکر
تو پتھر کے جھوٹے صنم دیکھتے ہیں

صبیحہ خان/کینیڈا

زندگی نے بھی کی عجب تقسیم
کر دیا مجھ کو بے سبب تقسیم
کتنے منہ زور ہو گئے ہیں لوگ
کر لیے اپنے اپنے رب تقسیم
اُس نے خود سے جو ضرب دی ہے مجھے
ہو گیا ہوں میں سب کا سب تقسیم
تم گئے ہو تو یہ لگے ہر پل
اب ہوا، اب ہوا، میں اب تقسیم
بازوؤں میں سمیٹ لو مجھ کو
کر دو میرے لبوں میں لب تقسیم
مجھ کو خود بھی خبر نہیں اعظم،
جانے میں ہو گیا ہوں کب تقسیم

کامران اقبال اعظم/ڈنمارک

شاعری (بہ لحاظ حروف تہجی)

اب کے دل بھی لگتا ہے راز دار مٹی کا
تیری گفتگو میں ہے اعتبار مٹی کا
اور دیر تک کتنی فصل جاں سنبھالوں گی
تم نے اس میں بویا ہے انتظار مٹی کا
دامن شکستہ میں داغ داغ لمحے ہیں
وقت نے بہایا ہے آبشار مٹی کا
میں بھی اک فریب جاں سی خاک کی کہانی ہوں
مجھ کو مل گیا آخر غم گسار مٹی کا
جس نے اپنے سینے پر خاک کو سجایا ہے
اُس کے پاس رہتا ہے اختیار مٹی کا
خاک کے سمندر کی لہر لہر گروی ہے
ساحلوں پہ ہوتا ہے کاروبار مٹی کا
آس کے دریچوں پر لفظ لفظ گریہ ہے
اب بھی قرض باقی ہے بے شمار مٹی کا

آسناتھ کنول/لاہور

کیا ہوئے آہ! وہ آنے والے
دھرتی پر پاؤں جمانے والے
داستاں اپنی سنائیں کیسے
ہیں کئی راز بتانے والے
میرے ہم راز ملیں گے کیونکر؟
راہ میں آنکھیں بچھانے والے
کیسی حالت میں ہیں آوارہ مزاج
دشت میں خاک اُڑانے والے
چند ہمدرد ملیں ایسے بھی
دوستی پیار نبھانے والے
خیر ہو مرے چمن کی یارب
آ گئے آگ لگانے والے
اس زمانے میں کہیں سے آئیں
رات میں دیپ جلانے والے
دیکھو اخلاق کہاں ہیں احباب
بزم میں شعر سنانے والے

ڈاکٹر اخلاق گیلانی/لاہور

اپنی خلوت میں ہے گزارا دن
شعر کہتے رہے ہیں سارا دن
بدگماں ہو کے اُٹھ گئے گر آپ
کیسے گزرے گا پھر ہمارا دن
ایک پل اس طرح گزار کے دیکھ
جس طرح ہم نے ہے گزارا دن
رات خوش خوابیوں میں گزرے گی
کر گیا ہے ہمیں اشارا دن
تان کر سر پہ دھوپ کی چادر
خوب مدت میں ہے گزارا دن
تیرگی برملا یہ کہتی ہے
روشنی کا ہے استعارہ دن
پیش گوئی غلط ہے یہ انور
باقی رہتے ہیں بس اٹھارہ دن

انور سدید/لاہور

نہیں ہے حرج، کہانی انھیں سنانے میں
کہ ہم سے لوگ ہی اب رہ گئے زمانے میں
نہ جانے کے لیے، وہ ہم سے دور رہتا ہے
اب ایک عمر لگے گی، اُسے منانے میں
ہمارے سامنے آؤ، حسین چہرہ لیے
ابھی ہے دیر ستاروں کے جھلملانے میں
کسی کا غم بھی نہیں بانٹتا یہاں کوئی
مجھے اُتارا گیا ہے، یہ کس زمانے میں
وہ اپنے چہرے پہ مسکان لے کے آئیں ذرا
کہ خرچ آتا نہیں کوئی مسکرانے میں
بھلا دیا جو مجھے تو نے، غم نہیں اس کا
بتا دے لطف ہے کیا مجھ کو بھول جانے میں
دُعاؤں کے لیے، دل کھول کر رکھا ہوا ہے
نہیں ہے کم کوئی شے، تیرے کارخانے میں
نمایاں ہیں سبھی کردار، اس کہانی کے
تری کمی رہی خالد، ترے فسانے میں

میجر خالد نصر راجا/لاہور

دربدر پھرتا ستارا داغ ہے
روشنی کا استعارہ داغ ہے
جانتی ہے خاک کی پوشاک بھی
آدمی کا جسم سارا داغ ہے
کیا تجھے معلوم ہے چشم طلب
زندگی کا ہر نظارا داغ ہے
ہر طرف برپا ہے اک جشن بہار
حسن لالہ جب کہ سارا داغ ہے
گردش کون و مکاں کے درمیاں
درد شب کا گر ہے چارا داغ ہے

شاعری (بہ لحاظ حروفِ تہجی)

گو غزل نقاش ہم نے بھی کہی
جس کو حاصل ہے اجارا داغ ہے

خالد نقاش/لاہور

اک چاند آسماں پہ ستارے بغیر تھا
جب تک وہ اس جہاں میں ہمارے بغیر تھا
پہنچے تھے جس مقام تلک میرے ساتھ تم
حیرت ہے میں وہاں پہ تمہارے بغیر تھا
دیکھو مدد کے واسطے وہ چل کے آ گیا
گرچہ یہ مدعا تو پکارے بغیر تھا
کشتی تھی بادبان کے چپوار کے بغیر
دریا تھا اور وہ بھی کنارے بغیر تھا
اُس کے بغیر زیست کا تھا، کٹھن سفر
گزرا تھا یوں کہ جیسے گزارے بغیر تھا
ہاتھوں میں اُس کے نام کی ریکھا نہ تھی رضی
اور آسمان اُس کے ستارے بغیر تھا

رضی الدین رضی/ملتان

محبت لطف کر دے، زندگی کو مہرباں کر دے
مجھے بھی اب کسی صورت، شریکِ کارواں کر دے
مری خواہش تو بس چادر برابر ہے، مرے مولا
زمیں پیروں تلے ٹھہرے، تو سر پر آسماں کر دے
مجھے اپنے پروں پر آسماں لے کر نہیں اُڑنا
میں جس مٹی میں رہتا ہوں، اُسی کو آشیاں کر دے
میں سانسوں کے تواتر سے، کہاں تک زندگی کھینچوں
اگر میں بن نہیں سکتا، تو مجھ کو رائیگاں کر دے

میں دو آنکھوں سے کیسے چار سو دیکھوں زمانے کو
جہاں میں جا نہیں سکتا، مجھے آ کر وہاں کر دے
یہی اک لمحۂ موجود ہے، زاہدؔ! جو اپنا ہے
نہ جانے گردشِ دوراں ہمیں کل کو کہاں کر دے

زاہد سعید زاہدؔ/لاہور

ہُو کا عالم ہے اور اکیلی سڑک
بن گئی ہے مری سہیلی سڑک
لے کے دائیں چلے کبھی بائیں
بن گئی ہے کوئی پہیلی سڑک
سب دراڑیں ہیں معتبر اس کی
جیسے مفلس کی ہو ہتھیلی سڑک
میں تو پلکوں سے پھول کاڑھ چکا
دیکھو اب بن چکی ہے بیلی سڑک
اپنی آہوں کا بھول کر شب بھر
خوب جی بھر کے مجھ سے کھیلی سڑک
میرا دل تو ہے خستہ ٹوٹی سڑک
لوگ چاہیں نئی نویلی سڑک

زاہد محمود شمس/ملتان

شکستہ حوصلوں پر منحصر ہونے کی تہمت بھی
بخت میں لکھی گئی ہے یہ ہزیمت بھی
بہت دشوار ہے کرنا تعین اس کی شدت کا
ترازو میں جو رکھی جائے نفرت بھی محبت بھی
بڑا بدشکل ہے آزادیٔ اظہار کا چہرہ
قلم کے سامنے پابندیاں بھی ہیں اجازت بھی

یہاں ناکامیوں کا بوجھ ڈھویا ہے بہت ہم نے
ہمیں کرنا پڑی خاموش رہنے کی مشقت بھی
تقدس جابجا ہوتا رہا نیلام رشتوں کا
یہاں کر دی گئی پامال دستاروں کی حرمت بھی
نہ جانے کس طرح خوشیاں دکھوں میں ڈھونڈ لیتے ہیں
وہ کیسے چھین لیتے ہیں بھلا ناتوں سے لذت بھی
ہنرمندی جو بکتی ہے تو ایسے کارخانوں میں
جہاں خیرات کی صورت میں دی جاتی ہے اُجرت بھی
ہماری تو بلائیں خار بھی لیتے ہیں راہوں کی
ہمیں تو تھپکیاں دیتی ہے سورج کی تمازت بھی

سرور ارمان/نارووال

بھولی بھالی آپ کی صورت سدا اچھی لگی
دیکھنا چلمن سے چھپ کر یہ ادا اچھی لگی
گھوم پھر کر آئی تھی جو آج کوئے یار سے
سب ہواؤں سے مجھے تو وہ ہوا اچھی لگی
عشاق سارے چاہتے ہیں اپنے اپنے رنگ سے
پر دلِ مغمور سے نکلی صدا اچھی لگی
جب سے اُس نے پیار کی ساری ہی رسمیں توڑ دیں
خود کو میں اچھا لگا نہ بے وفا اچھی لگی
پیار والے کم ملے اور ہرجائی بہت
جس جگہ وعدہ کیا تھا وہ ہی جا اچھی لگی
آج چونکہ عید تھی اُلفتؔ بڑا تھا منتظر
سرخ جوڑے میں تو وہ بے انتہا اچھی لگی

ڈاکٹر سعید اُلفتؔ/لاہور

شاعری (بہ لحاظ حروف تہجی)

بخت سکندر ہونے سے ڈر لگتا ہے
مجھ کو تونگر ہونے سے ڈر لگتا ہے
تری خواہش دل میں ٹھاٹھیں مارتی ہے
آنکھ سمندر ہونے سے ڈر لگتا ہے
ارمانوں کی فصل بھی کٹنے سے پہلے
دل کے بنجر ہونے سے ڈر لگتا ہے
عشق حدوں سے دور نکل تو جاؤں میں
مجھ کو پتھر ہونے سے ڈر لگتا ہے
پیار کے رنگ میں چنری رنگ تو لوں لیکن
مجھے قلندر ہونے سے ڈر لگتا ہے
جب سے نام سفینہ رکھا ہے اپنا
مجھے سمندر ہونے سے ڈر لگتا ہے

سفینہ سلیم چوہدری/لاہور

گر محبت کا سلسلہ رکھنا
درد سہنے کا حوصلہ رکھنا
تیرگی نے سکھا دیا مجھ کو
روشنی کے لیے دیا رکھنا
ڈال لینا نظر محبت کی
روبرو جب بھی آئینہ رکھنا
راہ اُلفت پہ چل پڑے ہو گر
یاد گھر کا نہ راستہ رکھنا
بے وجہ مت کبھی گلہ کرنا
اپنی سوچوں میں ضابطہ رکھنا
دامن حق نہ چھوڑنا ہرگز
یاد حالات کربلا رکھنا
نہ کبھی آئے پاس میں ہرگز
گل سے خود کو نہ تم جدا رکھنا
عشق اس کا سکھا گیا مجھ کو
ہنستی آنکھوں میں رتجگا رکھنا
عشق آتش ہے راکھ کر دے گا
تم ذرا اس سے فاصلہ رکھنا
اپنے ہونٹوں پہ خیر کی صابرؔ
ہر کسی کے لیے دعا رکھنا

صابر انصاری/ملتان

دل میں اُس کا ہی دھیان رہنے دے
جسم میں کچھ تو جان رہنے دے
کھینچ لی پاؤں سے زمیں تو نے
سر پہ تو آسمان رہنے دے
اپنے بارے میں سوچ اے ناداں
فکر کون و مکاں رہنے دے
عاجزی کو بنا شعار اپنا
ظاہری آن بان رہنے دے
کھل نہ جائے کہیں بھرم تیرا
مجھ کو تو بے زبان رہنے دے
اس قدر رنج و غم نہ دے مجھ کو
اے میرے مہربان رہنے دے
مرنے والے ہیں ہم تو لفظوں سے
اپنے تیر و کمان رہنے دے
وہ بھی تم پر رحیلؔ مرتے ہیں
ایسے وہم و گمان رہنے دے

عاشق رحیل/لاہور

اُن سے جب تک ہوئی آشنائی نہ تھی
چوٹ ہم نے کبھی ایسی کھائی نہ تھی
اُن کے چہرے کی رنگت بدلنے لگی
داستاں تو ابھی تک سنائی نہ تھی
کھل گئے ہیں ضرور ان کے گیسو کہیں
گھر کے ایسی گھٹا پہلے آئی نہ تھی
پوچھتے ہیں رقیبوں کے گھر کا پتہ
اس سے پہلے تو نوبت یہ آئی نہ تھی
جن کے ہاتھوں میں قسمت کے تھے فیصلے
ان کے در تک ہماری رسائی نہ تھی
بڑھ گئی ہیں رحیلؔ اپنی بے تابیاں
زندگی تو ابھی مسکرائی نہ تھی

عاشق رحیل/لاہور

لہجہ خنجر ہو سکتا ہے
پھول بھی پتھر ہو سکتا ہے
غم کے آنسو دینے والے
آنکھ ترا گھر ہو سکتا ہے
میرے سر پر بوجھ ہے جو
تیرے سر پر ہو سکتا ہے

شاعری (بہ لحاظ حروف تہجی)

غم جو باہر دکھتا ہے
دل کے اندر ہو سکتا ہے
غور سے دیکھو قطرے میں
ایک سمندر ہو سکتا ہے
بندہ ہوش میں رہ کر کیا
مست قلندر ہو سکتا ہے
بندر گر انسان بنا
انسان بھی بندر ہو سکتا ہے

الحاج عبدالرشید ارشد/وہاڑی

آسماں اور برسنے پہ نکھر جائے گا
پر جو سیلاب ہے آخر وہ کدھر جائے گا
اشک رخسار کو سیراب تو کر دے گا مگر
آنکھ کے ساتھ کہاں تک یہ ہنر جائے گا
اپنی کم مائیگی فہم سے مایوس نہ ہو
وحشت فکر سے اک دشت ہی بھر جائے گا
اس لیے ہوں میں ہر اک راہ گزر کے ہمراہ
میں نہ گر ہوں گا تو کس سمت سفر جائے گا
خود کو ان برگدوں کے سائے سے بچائے رکھنا
ان کا سایہ بھی ترا لے کے ثمر جائے گا
روح پہنچے کہ مرا جسم جہاں بھی پہنچے
دور تک خاک وطن تیرا اثر جائے گا
کنج تنہائی میں اک شور خوشی ہے برپا
گھر کے عفریت سے ماحول بھی ڈر جائے گا
منبع دل سے نکل کے جو یہ بہتا ہے رؤف
اک نہ اک روز یہ دریا بھی اُتر جائے گا

پیر عبدالرؤف شاہ/ننکانہ صاحب

بچا ہے کوئی کبھی گردش زمانہ سے
پناہ کس کو ملے آسماں کے ہوتے ہوئے
میں بامراد ہوں ہر گام پر اسی کے سبب
میں بے نیاز ہوں ہر اک سے ماں کے ہوتے ہوئے
یہ کیسے موڑ پہ لے آئی زندگی مجھ کو
ہے دشمنوں کی طلب مہرباں کے ہوتے ہوئے
قریب رہ کے بھی دیکھا ہے خود سے دور اُس کو
میں دھوپ سہتا رہا سائباں کے ہوتے ہوئے
میں اپنی ذات میں خود ہی سمٹ گیا ہوں رضا
شعور وسعت کون و مکاں کے ہوتے ہوئے

علی رضا/ساہی وال

پائندہ ہے صباحت انجیل ہست و بود
اب ہوگی اسم ذات سے تکمیل ہست و بود
بے شک مجھے وجود سے کوئی غرض نہیں
لکھی ہے پھر بھی روح پہ تفصیل ہست و بود
ہر چند میری کیمیا فردا نژاد ہے
میں کر رہا ہوں آج بھی تعمیل ہست و بود
شب بھر اسی نواح میں پھیلے گی روشنی
ہوگی مرے چراغ سے ترسیل ہست و بود
تبدیل ہو سکا نہ مرے شہر کا مزاج
میں بھی وہی ہوں اور وہی تمثیل ہست و بود
سوؤں گا دیر سے کبھی جاگوں گا دیر سے
کم ہوگی جب بھی راحت تقلیل ہست و بود
ساجد کتاب لذت دیروز کھولیے
کرنے لگے ہیں آئنے ترتیل ہست و بود

غلام حسین ساجد/لاہور

ہوگی نہ مجھ فقیر سے تعبیر ہست و بود
یعنی رہوں گا آج بھی نخچیر ہست و بود
کیا رُک سکے گا میری ہزیمت کا سلسلہ
کیا ٹوٹ پائے گی کبھی زنجیر ہست و بود
میں کھو گیا صباحت فردا کے کھوج میں
پائی مرے وجود نے تنویر ہست و بود
کیوں کر مجھے پسند نہ آئے گی چاند رات
بڑھتی ہے اس چراغ سے تنویر ہست و بود
کوئی نہیں ہے نجم صداقت سے ماورا
ہر آدمی پہ فرض ہے توقیر ہست و بود
کیا مل سکیں گے صبح درخشاں سے میرے خواب
تبدیل ہو گئی اگر تدبیر ہست و بود
ساجد کھڑا ہوں شمع بصارت کے روبرو
رکھی ہے طاق صبر پہ شمشیر ہست و بود

غلام حسین ساجد/لاہور

شاعری (بہ لحاظ حروفِ تہجی)

سب میسر ہے بے دلی پھر بھی
سونی لگتی ہے دل گلی پھر بھی
ہم ہتھیلی پہ سر نہیں لائے
داد دیتی ہے خودسری پھر بھی
کب مقدر کی دین پر بیٹھے
مانگی لگتی ہے ہر خوشی پھر بھی
خوف کیا ہے کہ مل نہیں پائے
ہم سفر ہو کے اجنبی پھر بھی
ہر قدم پر تو مرے ساتھ مگر
مجھ کو لگتی ہے کچھ کمی پھر بھی
وصل کی انبساط سے سرشار
آنکھ رکھتی ہے کچھ نمی پھر بھی
تھک گیا آسماں زمیں والو!
دل میں رکھتے ہو ناخوشی پھر بھی
سانس چلتی ہے، وقت کٹتا ہے
اس کو کہتے ہو زندگی پھر بھی

فرح دیبا/اسلام آباد

عالم ناصبور سے پہلے
میں کہاں تھا ظہور سے پہلے
ایک عرصہ زمین چومی ہے
آسماں نے غرور سے پہلے
آنے والے کو جانتا ہوں میں
مل چکا ہوں حضور سے پہلے
امن کا راج تھا یہاں کاشف
نیتوں میں فتور سے پہلے

کاشف بٹ

جو خنجر میرے سینے میں گڑا تھا
وہ میرے حوصلے سے بھی بڑا تھا
جھکانا چاہتا تھا مجھ کو کل تک
وہ دشمن میرے پاؤں میں پڑا تھا
جو کرنا چاہتی تھی صلح سب سے
میں اپنی اُس انا سے بھی لڑا تھا
بوقتِ مرگ بھی مانگا نہ کچھ بھی
اگرچہ وقت وہ مجھ پر کڑا تھا
یزیدی قوتوں کے سامنے، میں
بڑی ہی شان وشوکت سے کھڑا تھا
بباطن مانتا تھا میری باتیں
بظاہر اپنی ضد پر، وہ اَڑا تھا
وہ دریائے محبت میں نہ ڈوبا
جو خودداری کے سر پر اک گھڑا تھا
محافظ تھا، قمر اسلاف کا جو
وہ تمغہ میرے سینے پر جڑا تھا

قمر حجازی/اوکاڑہ

ہر اک موڑ پر آزمائے گئے ہم
ضرورت سے زیادہ رُلائے گئے ہم
خوشی بانٹتے عمر گزری ہے اپنی
نجانے کیوں پھر ستائے گئے ہم
تہی آنکھو سلجھا دو اُلجھی پہیلی
کیوں کہ نظروں سے اکثر گرائے گئے ہم
تماشائیوں میں نہ تھے ہم کبھی بھی
تماشہ تو پھر بھی بنائے گئے ہم
ہمیں تھی سحر چاہ پھولوں کی کب سے
شراروں کے نزدیک لائے گئے ہم

نادیہ سحر/لاہور

سلونی شام کی جھوٹی کہانی بیچ آتے ہیں
کسی سے وصل کی نیلی نشانی بیچ آتے ہیں
اسی پونجی سے شاید آخری دن چین سے گزریں
جوانی کی یہ ساری رائگانی بیچ آتے ہیں
زبانوں کی نئی تشکیل کی حد سے ذرا پہلے
پرانے لفظ اور ان کے معانی بیچ آتے ہیں
ابھی بازار ہے، مل جائیں گے کچھ دام بھی اچھے
محبت نام کی اک شے پرانی بیچ آتے ہیں
"مرے احباب مجھ سے بے تحاشا پیار کرتے ہیں"
چلو، بغداد جا کر یہ کہانی بیچ آتے ہیں
وہ شہروں میں بھٹکتے رہتے ہیں پھر در بہ در ناصر
جو بستی میں بزرگوں کی نشانی بیچ آتے ہیں

ناصر علی سیّد/پشاور

شہر خوش بخت ہیں

شہر خوش بخت میں
جب، تو
گھر سے نکلتی ہے
گلیاں دمکتی ہیں
رستہ چمکتا ہے
مہکار اُڑتی ہے
بازار سجتے ہیں
سینوں میں لذت اُترتی ہے
لوگوں میں جذبے چمکتے ہیں

جب
بھاری پلکیں
اُٹھاتی ہے
ماتم کی مجلس بپا کر کے
صدیوں کو بھوبل بناتی ہے
ملاح
کشتی کو کھیتے ہیں
دریا کا پانی لرزتا ہے
پانی کے سینے میں
چپو اُترتا ہے
سورج اُبھرتا ہے
کرنیں بکھرتی ہیں
پیڑوں کی شاخیں نکھرتی ہیں
میدان
سیال سونے سے بھر جاتے ہیں!
شہر خوش بخت میں
جب، تو
گھر سے نکلتی ہے
اسطور کی جو حقیقت ہے
ایمان کا جو تقاضا ہے
باغی جو نعرہ لگاتا ہے
مذہب جو تعلیم دیتا ہے
سائنس جو انکار کرتی ہے
شاعر جو کہتا ہے
اُن سب کی تصدیق ہوتی ہے
تو اپنی پلکیں جھکاتی ہے
اور رات آتی ہے
پیڑوں کے خیموں میں
خاموشی ہوتی ہے
پتوں کی لمبی زبانیں لٹک جاتی ہیں
اک ستارے کی لو سے
اُلجھتا ہوا دل مچلتا ہے
آفاق کھل جاتے ہیں
موم بتی کی چوٹی سے
شعلہ نکلتا ہے!!

اقتدار جاوید

بچے

وہ بچے...... جو ستاروں کی طرح چمکتے ہیں
مگر افسوس
سڑکوں پر...... ہاتھ اُٹھائے پھرتے ہیں
گرد و غبار کے اچکن پہنے
راکھ اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر
روزی روٹی ڈھونڈتے ہیں
وہ بچے تپ دق، ملیریا سے انجان
ہاتھ پاؤں جن کے چھوتے رہتے ہیں
اور...... اُن کے لرزتے کندھے
موت کی بوسہ گاہ بنتے ہیں
وہ بچے
جو ہاتھ میں وائپر اُٹھائے
گاڑیوں کے شیشے صاف کرتے
کڑوی کڑوی باتیں سنتے ہیں
وہ بچے
جو پٹڑیوں پر آوارہ پھرتے ہیں
دن بھر آوارہ پھرنے سے
تھک کر چور ہو جاتے ہیں
چوراہوں میں سو جاتے ہیں
کاش! ان کے پاس کوئی ایسا طلسم ہوتا
وہ اپنی خواہشیں ساری
اس سے پوری کر لیتے
خود کو بدل لیتے
اپنے خوابوں کی تکمیل کرتے
مگر افسوس!
ان کے پاس تو
صرف خوابوں کی دُنیا ہے
جس کی تکمیل نہیں ہوتی......!

جابر نظامی / ٹیکسلا

کون سا بیٹا وہ تو آوارہ گلیوں کو بیٹا ہے
تمہارے بیٹے تو وہ ہیں
جو تمہاری گود میں کھیلتے ہیں
وہ سردی کی ٹھٹھرتی راتوں کی
بند دکانوں کے سامنے بنچوں کا بیٹا ہے
ہمارے بیٹے تو وہ ہیں جن کے
تمہاری بیوی نے بوسے لیے ہیں
وہ تو ہوٹلوں کے بچے ہوئے
ٹکڑوں کا بیٹا ہے
تمہارے بیٹے تو وہ ہیں
جو تمہارے کاندھوں پہ جھولتے ہیں
وہ تو ان گلیوں کا بیٹا ہے

شاعری (بہ لحاظ حروف تہجی)

جن پہ چلتے چلتے اُس کے چھپے پاؤں
اور بھی سیدھے ہو گئے
اچھا.....تو تم ہواُس کے سیاہ وسفید کے پہرے دار

حنا عنبرین

خدا کی بستی

حریص وقتوں کی بے پناہی
تمام بستی میں زرد چہروں پہ گمراہی کی دلیل بن کر
نظر سے منظر مٹا رہی ہے
زبان لفظوں کو کھا رہی ہے
پلکتوں کے اثیم لہجے
جوایک مدت سے تن کے کاسے میں
روح بھر کے کھڑے ہوئے ہیں
سفر کے سکتے میں اپنے رستوں کی وسعتوں کو اسیر کرتے
خود اپنے ہونے کی غم گزیدہ سفاہتوں میں
پڑے ہوئے ہیں
عمل کے ظلمد کرم کے باغی
کسی مسیحا کے منتظر ہیں
فلک کے زینوں سے جو اُتر کے
حریص وقتوں، اثیم لہجوں کو ذوق صدق وصفا بھی دے گا
خدا کی بستی میں بسنے والی
نحیف پیکر اُداس روحوں کو اذنِ فیض شفا بھی دے گا

پروفیسر رائے عمیر علی واصف/ننکانہ صاحب

کھاتہ محبت کا

نشاط غم درد بے کسی سے
کچھ اتنا بھی مختلف نہیں ہے
کہ ناامیدی کو
حسرت سے ملا کر دیکھوں تو
سود در سود قرض جاں کا حساب نکلے
یہ سارا کھاتہ محبت کا
محاسب حسن
اپنی مرضی سے لکھ رہی ہوں
میں اپنی دیوانگی سے خوش ہوں
میری آوارگی کو اب تک
کوئی ٹھکانہ نہیں ملا ہے

شازیہ محسن/خانیوال

وہ لڑکی

خواب......!
کہاں ہیں؟
اور تم کن آنکھوں کی بات کیا کرتے ہو؟
کہر کی چادر اوڑھے جو لڑکی گزری ہے
اس کا نام پتہ پوچھو ہو؟
اس کا کوئی نام نہیں ہے
گھر......؟
ہوتا تھا......
لیکن شاید گھر بھی نہیں تھا
دھوکا تھا بس
اس نے تم کو روکا تھا؟
کب؟
یونہی سرِ رہ؟
کیا کہتی تھی؟
عشق......؟
تو کیا تم سچ سمجھے تھے؟
اب بھی؟
لیکن
کہر کی چادر میں لپٹی وہ لڑکی جس کا نام نہیں ہے
جس کا کوئی مقام نہیں ہے
جھوٹی بھی تو ہو سکتی ہے
ہو سکتا ہے جو لکھا ہو جھوٹ لکھا ہو
ہو سکتا ہے آج کسی سے سچ کہتی ہو
پوچھ کے دیکھو
ہو سکتا ہے
وہ لڑکی جو سب کچھ بول دیا کرتی تھی
چپ رہتی ہو

عمیرہ احمد/لاہور

حافظ شرازی کے ایک مقطع کا منظوم ترجمہ

غزل گفتی و در سفتی بیا و خوش بخواں حافظ
کہ بر نظم تو افشاند، فلک عقد ثریا را

اے حافظ! غزل کہتے رہو اور موتی پروتے رہو اور (ان غزلوں کو) خوش بیانی کے ساتھ ادا کرتے رہو کہ تمہاری ان نظموں (غزلوں) کو سن کر آسمان ''ثریا'' کے ستاروں کا ہار نچھاور کرتا ہے۔

منظوم مفہوم:

غزل کہتے رہو
موتی پروتے جاؤ، اے حافظ!
اور ان غزلوں کو
خوش انداز میں
پڑھتے بھی جاؤ تم
کہ یہ غزلیں تمہاری سن کے
شب کو آسماں
تارے نچھاور کرتا رہتا ہے

محمد ممتاز راشد/لاہور

ماحولیاتی غزل

شکایت' ہے مجھے بادِصبا سے
مہک ڈیزل کی آتی ہے ہوا سے
دھواں پھر کیوں نہ چھوڑے ہر سڑک پر
یہ ویگن چل رہی ہے ٹک مکا سے
پڑوسن اپنے گھر کا سارا کوڑا
گلی میں پھینکتی ہے کس ادا سے
گٹر میں گر کے بچ نکلا ہے شاید
یہی لگتا ہے اُس کے نقشِ پا سے
نگل جائیں گے ساری آکسیجن
مشینیں کارخانے اس فضا سے
عذابِ جاں ہے "پولی تھین شاپر"
خدا محفوظ رکھے اس بلا سے

سرفراز شاہد/اسلام آباد

کیسا عجیب آیا ہے اس سال کا بجٹ
مرغی کا جو بجٹ ہے وہی دال کا بٹ
جتنی ہے ایک کلرک کی تنخواہ آج کل
اتنا ہے بیگمات کے اک گال کا بجٹ
صرف ایک دن میں ۲۰ مسافر ہوئے ہلاک
حاضر ہے سائیں گلشن اقبال کا بجٹ
ٹی وی کا یہ مذاق ادیبوں کے ساتھ ہے
شاعر سے دُگنا رکھ دیا قوال کا بجٹ
بچھڑے یہ لوگ جب تو مہینہ تھا جون کا
سوہنی بنا رہی تھی "مہینوال" کا بجٹ
داماد کو نکال کے جب بھی ہوا ہے پیش
سالوں نے پاس کر دیا سسرال کا بجٹ
بکتی ہے اب کتاب بھی کیسٹ کے ریٹ پر
کیسے بنے گا غالب و اقبال کا بجٹ
ماں کہہ رہی تھی رنگ "لپ اسٹک" کے دیکھ کر
چٹ کر دیا بہو نے میرے لال کا بجٹ
دونوں بنیں ہیں باعث تکلیف آج کل
اسحاق ڈار اور نئے سال کا بجٹ

خالد عرفان/امریکہ

اعتراف

غلطی پر اب کیا پچھتانا
جوبن کا تھا دور سہانا
بھول گیا تھا میں دیوانہ
بچے کم خوشحال گھرانہ

شاعر کے گھر ڈاکہ

شاعر کے گھر میں آگئے اک رات کچھ ڈکیت
وہ اسلحہ بھی لائے تھے سب اپنے ساتھ میں
گھنٹوں کے بعد بھی انہیں جب کچھ نہ مل سکا
وہ سو کا نوٹ دے گئے شاعر کے ہاتھ میں

کام کا لڑکا

اک دن داماد نے کی یہ شکایت ساس کو
آپ کی اس لاڈلی میں ہیں ہزاروں خامیاں
ساس بولی ہیں یہ اس کی بدنصیبی کا سبب
ورنہ مل جاتا اسے بھی کام کا لڑکا میاں

جیسے کو تیسا

اک گدھے کی موت پر مالک سے ازراہِ مذاق
چند لڑکوں نے کہا کہ وہ بھی دل افگار ہیں
دیکھ کر لڑکوں کا یہ انداز مالک نے کہا
کیا خبر تھی اس گدھے کے اتنے رشتہ دار ہیں

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی/گوجرانوالہ

دائمی مرض

مریضِ دل کی بیماری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
دواؤں کی خریداری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
جسے دیکھو نیا نسخہ وہ ہم پر آزماتا ہے
طبیبوں کی وہ خونخواری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
طبیب و ڈاکٹر عطار و وید ہو ہومیو پیتھک
وہی سب کی دکاں داری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
دوائیں بڑھتی جاتی ہیں اگرچہ روز نسخے میں
مگر قائم وہ بیماری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
نہیں اب بانگ دے سکتا ہمارے پیٹ میں مرغا
کہ روٹی ڈال سے یاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
میں نسخہ ان سے لکھوا کر دوا پوری نہیں کھاتا
کہ اپنی جان یہ پیاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

مختصر ادبی خبریں/تقریبات

تعزیت

پچھلے دنوں ملک کے ماہر تعلیم، ریڈیو، ٹی وی کمپیئر و پروڈیوسر اور اردو پنجابی کے معروف شاعر اعزاز احمد آذر مختصر علالت کے بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ادارہ ''ارژنگ'' مرحوم کے بلند درجات کے لیے دُعا گو ہے اور لواحقین کے غم میں برابر شریک ہے۔

تعزیت

حال ہی میں منفرد لب ولہجہ کے معروف شاعر و ادبی صفحہ روزنامہ ''جنگ'' کے سابق ایڈیٹر حسن جاوید قضائے الٰہی سے انتقال فرما گئے۔ یہ خبر ادبی حلقوں میں بڑے رنج و غم کے ساتھ سنی گئی۔ ادارہ ''ارژنگ'' مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔ پسماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی کے جذبات رکھتے ہوئے مرحوم کے درجات کے لیے دعا کرتا ہے۔

مظہر کلیار کے ایم فل کا مقالہ بہ عنوان ''عطاء الحق قاسمی کے مزاحیہ کرداروں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ''

نادرن یونی ورسٹی نوشہرہ کے پی کے میں ایم فل کے طالب علم مظہر کلیار نے ممتاز کالم نویس، ڈرامہ نگار، سفرنامہ نگار اور شاعر عطاء الحق قاسمی کے مزاحیہ کرداروں کے تحقیقی وتنقیدی جائزے کے طور پر اپنا تھیسز مکمل کرلیا ہے جو کہ زیر نگرانی پروفیسر سیّد اشفاق حسین بخاری تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ اس تھیسز میں عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں مزاحیہ کرداروں کا جائزہ بہت تفصیل اور خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔ مقالہ منظوری کے بعد کتابی صورت میں بھی شائع ہوگا جو ادب کے قارئین کے لیے نہایت اہم ہوگا۔

زیب النساء فاؤنڈیشن اور حلقہ اعجاز ادب پاکستان کے زیر اہتمام (۱۴) واں سالانہ نعتیہ مشاعرہ

زیب النساء فاؤنڈیشن اور حلقہ اعجاز ادب پاکستان کے زیر اہتمام (۱۴) ویں سالانہ نعتیہ مشاعرہ کا اہتمام مقبرہ زیب النساء لاہور میں کیا گیا۔ جس کی صدارت علی اعجاز (فلمسٹار) نے کی۔ مہمانانِ خصوصی گلزار بخاری، الحاج صوفی محمد یعقوب اور غزالہ بیگ تھے۔ جبکہ مہمان اعزاز ایڈمرل (ر) جاوید اقبال، رانا سلمان اور یامین ملک تھے۔ تلاوت قرآن حافظ محمد امین نے کی۔ زیب النساء فاؤنڈیشن کی چیئرپرسن سیدہ طاہرہ شیرازی نے سپاس نامہ پیش کیا۔ نظامت کے فرائض ادا کرتے ہوئے حرف آغاز میں حلقہ اعجاز ادب پاکستان کے چیئرمین، معروف شاعر اور کالم نویس اعجاز فیروز اعجاز نے بتایا کہ حلقہ اعجاز ادب کے زیر اہتمام بے شمار مشاعرے، کتابوں کی تقاریب رونمائی اور دوسرے ملکوں اور شہروں سے آئے ہوئے شاعروں کے ساتھ اعزازی نشستوں کا اہتمام کیا جاچکا ہے۔ جبکہ یہ ۵۴واں اجلاس، ۱۴ ویں سالانہ نعتیہ مشاعرہ کے سلسلہ میں منعقد کیا گیا ہے۔

سالانہ نعتیہ مشاعرہ میں نعتیہ اور ملی حوالے سے کلام پیش کیا گیا۔ جن شعراء کرام نے اپنا کلام پیش کیا اُن میں علی اعجاز (فلمسٹار)، گلزار بخاری، الحاج صوفی محمد یعقوب، اعجاز فیروز اعجاز، غزالہ بیگ، سیدہ طاہرہ شیرازی، پروین سجل، روبینہ کوثر، مختار جاوید، خلش بجنوری، محمد ممتاز راشد، عدل منہاس لہوری، ایوب ندیم، ریاض رومانی، حکیم سلیم اختر، طارق چغتائی، محمد علی صابری، میاں صلاح الدین، مقصود کاوش، کامران ناشط، محمد آصف، افضال عاجز، آفتاب خان، میجر (ر) خالد نصر، عبدالمجید چٹھہ، یمین تمبولوی، ڈاکٹر ابرار، ایم آر مرزا، ندیم شیخ، سیّد فراست بخاری، عطاء العزیز، ریاض احمد جسٹس، سیّد امتیاز شیرازی، سیّد ضیغم شیرازی، منیر احمد، محبوب احمد ملک، ڈاکٹر شاہد، ارسلان اعجاز و دیگر شامل تھے۔ آخر میں شہدائے پشاور سمیت تمام مرحومین کے لیے دُعائے خیر کی گئی اور مہمانوں کی خصوصی تواضع کی گئی۔

گلشن ادب کا ماہانہ مشاعرہ

گلشن ادب کا ماہانہ مشاعرہ عاشق رحیل کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا۔ مشاعرے کی صدارت ممتاز شاعر گلزار بخاری نے کی۔ جبکہ مہمانانِ خصوصی میں جاپان سے تشریف لائے ہوئے شاعر، کالم نویس اور مترجم عامر بن علی کے علاوہ پنجابی اور اُردو کے معروف شاعر ناز اوکاڑوی اور ظہیر احمد ظہیر تھے جن شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا ان میں عباس مرزا، عاشق رحیل، اقبال راہی، عدل منہاس لاہوری، حسن عباسی، عاصم خواجہ، عقیل شافی، محمد امین ایمی، محمد صدیق اوکاڑوی، ایم آر مرزا، عطاالعزیز، ابرار ندیم، ہمایوں پرویز شاہد، شاہد رومانی، صابر چودھری، خالد خورشید، عثمان محمود، علامہ فضل حق گلشن، اقبال کیفی، میجر خالد نصر، طارق چغتائی، سید فراست بخاری، حاجی لطیف کھوکھر، آخر میں مہمانانِ خصوصی ظہیر احمد ظہیر، ناز اوکاڑوی اور صاحب صدر نے سامعین کے سامنے اپنا کلام پیش کیا۔

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: تقاضے/شاعر: نصرت صدیقی/صفحات: 208 / قیمت: 350 روپے/ رائے: ظفر اقبال

ناشر: مثال پبلشرز، رحیم سنٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

جدید اور عمدہ شاعری تخلیق کرنے کے لیے نوجوان ہونا کچھ ایسا ضروری نہیں۔ اگر آپ آنکھیں کھلی رکھتے ہیں اور صاحب توفیق بھی ہیں تو یہ معجزہ برپا کرنا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں ہے۔ جبکہ جہاں نوجوان شعرا بوڑھی شاعری کرتے نظر آتے ہیں وہاں کئی سینئر شعرا بھی خلاف توقع عمدہ شعر کہہ رہے ہیں۔ اگرچہ شعر کی تحسین و توصیف کے پیمانے تبدیل ہو چکے ہیں تاہم اچھے شعر کا سراغ ہم نہیں لگاتے بلکہ وہ اپنی نشاندہی خود کرتا ہے۔ فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے نصرت صدیقی ایک کہنہ مشق شاعر ہونے کے باوجود تازہ فکر ہونے کی دولت سے بھی مالا مال ہیں۔ شاعر کا اصل کام یہ دیکھنا ہے کہ شعر بنا ہے یا نہیں۔ کسی مجموعہ غزل میں سے پانچ شعر بھی کام کے نکل آئیں تو اسے غنیمت سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ شعر عام طور پر ذاتی پسند اور ناپسند کا مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ اس لیے اگر کتاب میں سے دس قارئین کو بھی پانچ پانچ شعر پسند آ جائیں تو یوں سمجھئے کہ عمدہ اشعار کی تعداد پانچ نہیں بلکہ پچاس ہے۔ البتہ قاری بھی دو نمبر نہیں بلکہ کمیٹیڈ ہونا چاہیے۔ جبکہ روٹین کے شعرا اور روٹین کے قارئین کا اپنا ہی ایک طبقہ ہے اور جو صاف پہچانے بھی جاتے ہیں اور یہ ماشاءاللہ بھاری اکثریت کے مالک بھی ہیں اور ان کی پر موشن کا کام بھی ساتھ ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ تاہم یہ رفتار نہایت درجے سست بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیونکہ اگر مصرعہ نہیں بنا تو ظاہر ہے کہ شعر کیونکر بنے گا۔ البتہ دونوں مصرعوں کو جوڑ کر شعر بنانا اس سے اگلا اور کٹھن مرحلہ ہے۔

میری ذاتی رائے میں شعر کے دونوں مصرعوں کو آپس میں زیادہ جڑا ہوا نہیں ہونا چاہیے۔ بصورت دیگر اس طرح سے بالعموم روٹین کا شعر ہی برآمد ہوگا جب کہ انھیں تھوڑا سا کھلا چھوڑ دینے سے ایک تازہ چیز برآمد ہونے کا امکان زیادہ ہے۔ بے ساختہ شعر کے مقابلے میں ایسا مصرعہ صاف پہچانا جاتا ہے جس کی تشکیل میں بہت زور لگایا گیا ہو۔ ظاہر ہے مصرعہ سازی کا مشقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ یہ جس قدر سہولت اور رسان سے آئے گا اسی قدر کارگر بھی ہوگا اور شعر کو شعر بنانے میں بھی مدد دے گا۔ نصرت صدیقی یہ فن اچھی طرح سے جانتا ہے۔ اس کے مجموعے میں اس کا یہ امتیاز صاف نظر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے اشعار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

نام کتاب: نسبتیں (حمد و نعت) /شاعر: ڈاکٹر خورشید رضوی/صفحات 120 / قیمت: 280 روپے/فلیپ: افتخار عارف

ناشر: انٹرنیشنل نعت مرکز پبلی کیشنز

سید گرامی مرتبت خورشید رضوی عصر حاضر میں اُردو دنیا کے ان نام دار و نمود ار صاحبانِ قلم میں ہیں کہ جن کی شاعری، تحقیق و تنقید اور دیگر علمی کارنامے مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی غزلیں اور نظمیں صاحبانِ ذوق میں اپنے اسلوبِ شعر، مضامین تازہ اور قدرتِ اظہار کے ساتھ ساتھ تازہ کاری کے اعتبار سے بھی اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ ان کا نیا مجموعہ شعر ''نسبتیں'' اس کلام پر مشتمل ہے جس میں حمدیں، نعتیں اور سلام شامل ہیں۔ مکے اور مدینے والوں کی نسبتیں اظہار کی منزلوں میں کیسے معجزے دکھائی ہیں اس کا اندازہ خورشید رضوی کی پیش نظر کتاب کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ روحانی تجربوں کی اساس عقیدہ و عقیدت پر ہوتی ہے۔ مگر شاعری میں اس کی داد کا معیار میرے نزدیک صرف اور صرف اس کے شاعرانہ محاسن پر متعین کیا جانا چاہیے۔ خورشید رضوی کے ہنر کی چھوٹ ایک ایک مصرعے کو جگمگائے ہوئے ہے۔ اُردو، فارسی اور عربی زبان و ادب کی روایتوں سے مکمل آگاہی اور اللہ کریم کی مرحمت خاص سے سرفراز دل نے فکر اور جذبے کی سطح پر جو گل کاریاں کی ہیں، وہ ہماری شاعری کا ایک درخشندہ باب ہیں۔ حضرات ابوطالب، حسان بن ثابت، کعب بن زہیر اور عبداللہ بن رواحہ کے سلسلہ خیر کثیر اور

اقبال اور محسن کاکوروی کے سرچشمہ نور کے تسلسل میں ہمارے بزرگ معاصرین حافظ مظہر الدین مظہر اور حفیظ تائب کے بعد خورشید نے جو پھول کھلائے ہیں وہ آنے والے زمانوں کو بھی معطر کرتے رہیں گے۔ انشاءاللہ

نام کتاب: رہتا ہے میرے ساتھ/ شاعر: احسان شاہد/ صفحات 160 / قیمت: 300 روپے/ فلیپ: عطاء الحق قاسمی

ناشر: نستعلیق مطبوعات، فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

خواب دیکھنے والی آنکھیں اور خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے والے لوگ مجھے پسند ہیں۔ احسان شاہد سے میری دوستی کا بنیادی حوالہ بھی اُس کی یہی دو بڑی خوبیاں ہیں۔ وہ ہمارے روایتی شعراء کی طرح خواب دیکھنے کے بعد ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ نہیں جاتا۔ بلکہ اُس کی تعبیر کے لیے عملی طور پر سرگرداں نظر آتا ہے۔ اگر وہ خواب دیکھتا ہے کہ برطانیہ میں پاکستانیوں کے وقار میں اضافہ ہو اور حکومتی حلقوں میں بھی اُن کا حصہ ہونا چاہیے تو وہ اس کے لیے عملی طور پر کوششیں کرتا اور بالآخر کامیاب ہوتا ہے۔ اگر وہ خواب دیکھتا ہے کہ افریقہ کے قحط زدہ علاقوں میں جا کر امداد کرے تو وہ اپنے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے وہاں پہنچتا ہے۔ احسان شاہد دردِ دل رکھنے والا شاعر، سچا انسان اور بہترین دوست ہے۔ ادیبوں کی روایتی منافقتوں، سازشوں، ریشہ دوانیوں اور مخالفتوں سے دور دیارِ غیر میں رہ کر وہ محبتوں کے چراغ جلانے میں ہر وقت مصروف رہتا ہے۔ ادب تو سب ادیب ہی تخلیق کرتے ہیں۔ مگر اُن میں معدودے چند ہی ایسے ہوتے ہیں جن کا وجود ادب اور ادیب دونوں کے لیے غنیمت ہوتا ہے۔ احسان شاہد بھی اُن میں سے ایک ہے۔ جو نہ صرف ادب کی ترویج کے لیے دامے درمے سخنے کوششیں کرتا ہے۔ بلکہ مستحق اور نادار ادیبوں کے لیے بھی بہت کچھ کرتا ہے۔ وہ مستقل مزاج اور دُھن کا پکا ہے۔ اپنی مضبوط قوت ارادی سے اُس نے اپنی زندگی اور ادبی زندگی میں حائل بے شمار رکاوٹوں کو خندہ پیشانی سے عبور کیا ہے۔

میں جب بھی احسان شاہد کو دیکھتا ہوں وہ مجھے گھنے اور سرسبز پیڑ کی طرح دکھائی دیتا ہے جس کی جڑیں محبت کی زمین میں بہت گہری ہوں۔ وہ پوری دُنیا میں اس طرح گھومتا ہے جیسے جوانی میں پاکستان کے شہروں میں گھوما کرتا تھا۔ مگر اُس نے اپنا تعلق اپنی مٹی، اپنے گاؤں اور اپنے لوگوں سے کبھی نہیں توڑا۔ میاں چنوں اس کے دل میں اور پاکستان اُس کی سانسوں میں ہے۔ دوستی کی ہر تعریف پر پورا اُترتا ہے اور دشمنی کے لفظ سے نا آشنا ہے۔ یہاں میں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ میں جس احسان شاہد کو جانتا ہوں شاعری اُس کی واحد خوبی نہیں ہے بلکہ قدرت کی طرف سے اُس کو ودیعت کی گئی بہت سی خوبیوں میں سے ایک ہے اور احسان شاہد کو اُس کی شاعری میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اُس سے ملاقات کی جا سکتی ہے اُس کی شاعری اس کے مہ و سال کا گوشوارہ ہے۔ اُس کی آپ بیتی ہے۔ مجھے ایسی ہی سادہ، شگفتہ اور آسان زبان میں کی گئی شاعری لگتی ہے جس میں شاعر کی شخصیت اور زندگی کے عکس جھلکتے ہوں۔ احسان شاہد کی شخصیت اور شاعری سے متعلق لکھنے کے لیے میرے پاس بہت کچھ ہے۔ مگر کتاب اور قاری کے درمیان میں نے زیادہ دیر حائل ہونے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

نام کتاب: حدودِ شام سے آگے/ شاعر: ارشد سعید/ صفحات 192 / قیمت: 300 روپے/ فلیپ: اظہار الحق

ناشر: مثال پبلشرز، رحیم سنٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

ہجر، ہجرتیں، وصال اور محبتیں ہمیشہ شاعری کے دل گرفتہ موضوع رہے ہیں۔ ہجر اُسی دن وجود میں آ گیا تھا جس دن دُنیا کے پہلے عاشق کو جدائی کا زخم لگا تھا۔ ہجرتیں بھی انسان کے لیے نئی کبھی نہیں رہیں تاہم پہلے زمانے اور تھے۔ ترکِ وطن کرنے والے قافلوں کی دھنک پر سوار ہو کر ان دیکھے جہانوں میں اُترتے تھے۔ پھر بحری جہاز آئے اور قرب اور بچھوڑے ناخدا کے ہاتھ میں آ گئے۔ لیکن ہجرت انسانی زندگی کے حوالے سے باقاعدہ Phenomenon تب ہوئی جب داستانوی اُڑن کھٹولے نہیں اصلی جہاز، فولادی پرندوں کی صورت، فضاؤں میں تیرنے لگے۔ یہ فولادی پرندے گوشت پوست کے طائروں کی طرح پروں

کو چھڑ پھڑاتے نہیں، بس اُفقی حالت میں ساکت رکھتے ہیں، لیکن انھوں نے جدائیوں کی اتنی قیامتیں برپا کیں کہ کیا سوشل سٹرکچر، کیا اقتصادی سلسلے اور کیا جذباتی حوالے، سب کچھ بدل کر رہ گیا۔ جگر گوشوں نے پوٹلیاں اور پیٹیاں چھینیں، اٹیچی کیس اُٹھائے، ٹرالی بیگ رواں کیے اور دور دیسوں میں جا بسے۔ دل ان کے مادرِ وطن کی یاد سے، ماں باپ کی پیاس سے اور دوست احباب کے فراق سے اَٹے رہے۔ آنکھیں چھلکتی رہیں، معاش دمکنے لگی، لیکن یاد، پیاس اور فراق نے دامن نہ چھوڑا۔ اکثر نے سب کچھ دل میں ہی رکھا لیکن چند خوش بخت ایسے بھی تھے جنھیں قسامِ ازل نے اظہار کا اسلوب دیا تھا۔ انھوں نے ترکِ وطن کے زخموں کو مصوری، کہانی اور شعر کے پھولوں میں بدل دیا۔ ارشد سعید انھی خوش بختوں میں ہے۔ روایتی شاعری کے عناصر، محبت اور ہجر و ہجرت تو اُس کی شاعری میں موجود ہیں ہی، عہدِ جدید کے مسائل کو جس انداز میں اُس نے تغزل کا لباس پہنایا ہے اس کے ذکر کے بغیر Diaspora کے اُردو ادب کا تذکرہ مکمل نہیں ہو پائے گا۔ وطنِ عزیز دہشت گردی کے جس عفریت کا سامنا کر رہا ہے ارشد نے اسے خصوصی طور پر اپنا موضوع بنایا ہے۔ ماؤں کے جگر گوشے آئے دن خاک اور خون میں لت پت پڑے ہوتے ہیں۔ امیرِ شہر، پہریداروں کے حصار میں ایک اور قسم کی زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ یہ ارشد سعید کی شاعری کا صرف ایک پہلو تھا۔ اس کے مجموعہ کلام میں ایسے کئی پہلو نظر آتے ہیں جیسے شاداب باغ میں سرسبز روشیں اِدھر سے اُدھر، دور تک جا رہی ہوں۔ بہت سے منظر ہیں، کبھی وہ حیران کرتا ہے اور کبھی غم زدہ حقیقتوں کے دریا اُسے وسوسوں کے سراب میں پڑے ملتے ہیں۔ مسافرت تو خواب تھا ہی، منزل پر پہنچ کر بھی خواب ہی استقبال کرتا ہے۔ زبان پر قدغن لگتی ہے تو دردِ دل کا ماجرا آنکھیں کہنے لگتی ہیں اور خاموشی بولنے لگتی ہے۔ ریگِ رواں شاعر کو صحرا بنا دیتی ہے۔ ہونٹوں پر تشنگی جم جاتی ہے لیکن یوں کہ بھلی لگتی ہے، پھر وقت دل کے دریا میں شگاف ڈال دیتا ہے۔ کشتیاں ڈوب جاتی ہیں، کنارے اپنی اپنی جگہ بدل لیتے ہیں۔ ایسے میں شاعر کو یوں چپ لگ جاتی ہے کہ ٹوٹ کر چاہنے کے باوجود بھی اظہار کو غیر ضروری سمجھتا ہے۔ یوں گردشِ وقت اپنی پیچیدگیوں میں اس قدر اُلجھا لیتی ہے کہ شاعر ترکِ محبت کے بہانے ڈھونڈنے لگتا ہے۔ ارشد کے کلام میں بہت سارے اشعار ایسے ملے جو عام ڈگر سے ہٹ کر ہیں۔ اچھوتے ہیں، دلکش ہیں اور دامنِ دل کو کھینچتے ہیں۔ ارشد سعید کی نظمیں بھی منفرد ہیں۔ کہیں اُن میں سمبل ہیں، کہیں کنائے، کہیں استعارے اور کہیں محض اشارے۔ نظموں میں اس نے طنز کے اوزار آزمائے ہیں۔ ارشد کا یہ پہلا شعری مجموعہ ہے۔ وہ نو جوان نہیں لیکن جوان ضرور ہے۔ وطن سے ہزاروں کوس دور بحرِ اکاہل کے کنارے وہ اُس ساحر کی طرح بیٹھا ہے جس کی بند ٹوکری میں بہت کچھ پڑا ہے لیکن ابھی اُس نے اُس میں سے بہت کم چیزیں دکھائی ہیں۔ اُس کے آنے والے مجموعوں کا انتظار کرنا چاہیے۔ میں یہ انتظار بے تابی سے کر رہا ہوں اس لیے کہ اُس کی بند ٹوکری میں جو کچھ بھی ہے، کہیں اور نظر نہیں آئے گا۔

نام کتاب: زاد حرف/ شاعر: اشرف نقوی/ صفحات 160 / قیمت: 350 روپے/ فلیپ: شاہین عباس

ناشر: انحراف پبلی کیشنز، سی/ 1 ایل ڈی اے پلازہ 55 لارنس روڈ لاہور

اشرف نقوی کی غزل ایک طرف قدامت اور اُس کے اسرار کا بیانیہ ہے اور دوسری طرف جدت اور اُس کے فشار کی کہانی۔ اس مجموعے کا خالق کہیں ثقافتی اور عصری تغیرات کو لحاظ میں رکھتے ہوئے اپنے شعری آہنگ کو بلند و پست کرتا ہے اور کہیں تاریخ و روایت پر استقامت کے ساتھ قانع اور مطمئن دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے نزدیک شاعری کا آرٹ، کرافٹ سے کوئی تضاد نہیں رکھتا۔ شعر کو محض مافی الضمیر کا پابند یا متبادل نہیں بنایا جا سکتا۔ غزل کے شاعر کو فکری صورت گری کا کرافٹ یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ معنی در معنی کے عمل کو ممکن بنا سکے اور اپنی غزل کو کسی ایک خیال یا نقطہ نظر کی عمومی سطح سے بلند تر کر سکے۔ ابلاغ اور تفہیم کے مروجہ پیمانوں کی پاسداری مقصود نہ ہو اور قاری کا خوف ہر آن دامن گیر نہ ہو تو انھی دو مصرعوں کی تنگ نائے میں آگے، بہت آگے کی سیاحت ممکن ہو سکتی ہے۔ ضروری نہیں کہ شاعر اور اُس کے قاری کے مابین تعلق فکری مناسبتوں ہی سے استوار ہو۔ قاری و شاعر مختلف و متصادم فکری منطقوں میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں اور مکالمہ کر سکتے ہیں۔ اشرف نقوی کی بہ طور شاعر اپنے عصر سے مزاحمت اُس کے اشعار میں جا بہ جا دکھائی دیتی ہے، جس کا اگلا مرحلہ متوقع طور پر تصادم بھی ہو سکتا ہے۔ طبیعیات و مابعد الطبیعیات کے دوراہے پر، شخصیت کے ظاہر و باطن میں ہوتا ہوا آج کے انسان کا فرسودہ و از کار رفتہ طرزِ سخن سے تصادم۔

نام کتاب: نوکِ خار ہے عشق/ مصنف: محمد حسین یاور/ صفحات 342 / قیمت: 300 روپے/ فلیپ: اقبال راہی

ناشر: تسکین ذوق، 40C ماڈل ٹاؤن، لاہور

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ حسین یاور اپنی عمر سے بڑا ادیب اور لکھاری ہے۔ ادب میں اپنا مقام بنانے کی لگن اسے مگن رکھتی ہے۔ وہ ہر حوالے سے باوقار زندگی گزارنے کا خواہش مند ہے اور کئی حوالوں سے وہ اس میں کامیاب و کامران ہے۔ اب اس کا شمار اچھے قلم کاروں میں ہونے لگا ہے۔ یہ اس کے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی اچھی خبر ہے۔ میں اس کے قلم کی روانی کو دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اس نے نثر کے میدان میں بھی اپنے قدم جما دیے ہیں۔ وہ ایک ایسی منزل کا مسافر ہے جس کے آثار دور سے ہی نظر آ جاتے ہیں۔ میں نے اس کی لکھی ہوئی ناول نما کہانی اور کہانی نما ناول کا ایک ایک لفظ پڑھا ہے مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ حسین یاور تشبیہات اور استعاروں کا بھی ماہر نکلا۔ اس نے اس نثر پارے میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ چکا چوند روشنی کے زمرے میں آتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ کی چاشنی سے سرشار یہ ناول کسی تجربہ کار تخلیق کار کی حقیقت پسندانہ کاوشوں سے کم نہیں۔ اس ناول میں محبتوں کی داستان لازوال لمحوں کی کیفیت کا تانا بانا بنتی نظر آتی ہے۔ ''نوکِ خار ہے عشق'' ایک ایسا ناول ہے جسے پڑھ کر قاری لفظوں کی بشاشت سے بھی آشنا ہوگا اور حسن وعشق کی نرالی کیفیتوں سے بھی آگاہی حاصل کرے گا۔ میرا خیال بلکہ یقین ہے کہ اگر حسین یاور نے اسی طرح محنت اور لگن کی رسی کو تھام کر رکھا تو یہ اپنے مقصد میں بھی کامیاب ہوگا اور شہرت کے بام پر بھی اس کے لیے پہنچنا آسان ہو جائے گا۔

نام کتاب: مجھے خطبہ نہیں آتا/ شاعرہ: جہاں آرا تبسم/ صفحات 140 قیمت: 400 روپے/ فلیپ: شہزاد احمد

ناشر: نیو کالج پبلی کیشنز، کوئٹہ

''مجھے خطبہ نہیں آتا'' کی نظمیں پڑھتے ہوئے مجھے اکثر یہ خیال آتا رہا کہ بلوچستان کی سنگلاخ اور سخت ترین قبائلی روایات کے حصار میں رہتے ہوئے جہاں آرا تبسم نے خواتین کے مسائل (جن کی بدصورتی یقیناً مہذب دنیا اور بالخصوص ہمارے معاشرے کے چہرے کا وہ داغ ہے جس سے نظریں چرانا کسی طور ممکن نہیں) پر اتنی اچھی بھرپور اور شعری ضروریات اور ضوابط کی مکمل پاسداری کے ساتھ نظمیں کہہ کر فکر کی جھیل کے سکوت میں پہلے پتھر کا کام کیا ہے۔ انسانی معاشرہ اُن کی نظموں کا ارتعاش یقیناً تادیر محسوس کرتے رہے گا۔ جہاں آراء کی نظمیں خصوصاً ''مجھے خطبہ نہیں آتا''، ''سنو چڑیا''، ''چھت کا جالا''، ''خود کلامی''، ''منٹو کے افسانے''، ''مسلسل موت''، ''آدھی گواہی''، ''کاروکاری'' اور ''کوئی تو ہو'' بے حد اذیت ناک اور فکر رسا موضوعات کی نظمیں ہیں جو قاری پر سکتہ طاری کر دیتی ہیں۔ جہاں آراء کی یہ نظمیں عورت کا نوحہ بھی ہیں تاریخ بھی اور زندگی کی تلخ حقیقت بھی۔ اُمید ہے کہ ان کی نظموں کا زیرِ نظر مجموعہ ''مجھے خطبہ نہیں آتا'' مستقبل کے اردو ادب کا سرمایہ افتخار ہوگا۔

نام کتاب: اُداسی رقص کرتی ہے/ شاعرہ: جہاں آرا تبسم/ صفحات 200 / قیمت: 400 روپے/ فلیپ: سرور جاوید

ناشر: سعد بک بینک، اُردو بازار لاہور

''اُداسی رقص کرتی ہے'' یہ وہ کیفیت ہے جس کے اظہار کے لیے شاید لفظوں سے بڑھ کر وجدان اور بصیرت کی ضرورت ہے۔ شاعر اپنی دنیا بنا لیتے ہیں، ایک ایسی دنیا جو خوشی، محبت اور امن کی دنیا ہے۔ تلخ حقائق اور مفادات کے ساتھ بارود کی بو سے آلودہ زندگی سے دور خواب کی ایک دنیا اور جب تلخ حقائق سے

نبرد آزما یہ سچے لوگ اپنی دنیا کے ساتھ ایک تعلق بنانے کے عمل سے گزرتے ہیں تو اُداسی رقص کرتی ہے۔
جہاں آرا تبسم کی شاعری دراصل اسی کیفیت کی عکاسی کرتی ہے۔ سچے جذبوں کی اس شاعری میں الفاظ کے مناسب استعمال کے ساتھ دل کی کیفیات کو اظہار کی جس جرأت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، یہ شاعرہ کا خاص انداز ہے اور اسے اپنے ہم عصر ساتھیوں میں ایک عمدہ اضافے کے طور پر سامنے لاتا ہے۔ ایک عورت کی آواز اور اس کے جذبوں کو غزلوں اور نظموں میں پُر اثر طریقے سے سمونے کا ہنر جاننے والی جہاں آرا کھلے لفظوں میں سچی بات کہنے والی شاعرہ ہے۔ اس کے خیالات کی دنیا خواب جیسی سہی مگر حیات کے تلخ حقائق سے جڑی ہوئی ہے۔ اسی لیے تو اس کی شاعری پڑھتے جایئے، دکھ اور سکھ ساتھ ساتھ ملیں گے۔ مسکراہٹ اور آنسو یکجا نظر آئیں گے۔ وہ متضاد کیفیات میں اپنے لیے اظہار کا اچھا راستہ تلاش کر لیتی ہے، جو بڑی حد تک اس کا اپنا راستہ ہے۔
سچائی اور جرأت اظہار، سماج کی زیادتیوں کے خلاف ایک عورت کا بولتا ہوا لہجہ، ماحول کی گھٹن، زندگی کی بے کیفی پر احتجاج، اچھے دنوں کی خواہش کے خواب آنکھوں میں سجائے اپنے یوٹوپیا میں رہنے والی معصوم سی لڑکی اور دنیا کی تلخیوں سے لڑتی ہوئی بہادر عورت مجھے جہاں آرا کی شاعری میں یہ کیفیات ملتی ہیں۔ اس میں ایک الگ بات یہ ہے کہ وہ اپنے خوابوں کی دنیا ضرور سجائے ہوئے ہے۔ مگر حیرت انگیز طور پر اپنے حال سے مطمئن ہے۔ خواب کے حسین جزیروں میں زندگی کے بوجھ سے تھکی ہوئی عورت جب اُداسی کو رقصاں دیکھتی ہے تو وہ ایک عجیب کیفیت سے گزرتی ہے اور پڑھنے والے کو اپنے ساتھ لے کر چلتی ہے۔ زیر نظر کتاب کو پڑھتے جائیں اس میں اُداسی کے رقص کے ساتھ ساتھ کئی مقامات مسکراتے اور کبھی کبھی بھرپور قہقہہ لگاتے آنسو بھی ملتے ہیں۔ اُمید کرتا ہوں کہ جہاں آرا اپنے توانا لہجے کو نہ صرف برقرار رکھے گی بلکہ اس میں مزید نکھار پیدا کرے گی۔

نام کتاب: محبت شاعری ہے/ شاعرہ: جہاں آرا تبسم/صفحات 240 / قیمت: 350 روپے/فلیپ: سحر انصاری

ناشر: نیو کالج پبلی کیشنز، آرچر روڈ کوئٹہ

جہاں آرا تبسم کئی برس سے ادبی دنیا میں شاعری کے ذریعے اپنی انفرادیت کو اُجاگر کر رہی ہے۔ ان کے کئی شعری مجموعے اب تک منظر عام پر آ چکے ہیں۔ وہ اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ ان کا کلام نہ صرف مشاعروں میں دلچسپی سے سنا جاتا ہے بلکہ رسائل و جرائد میں بھی ان کی شاعری سے لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ نہایت کم عمری میں وہ نہ صرف پاکستان بھر میں خود کو منوانے میں کامیاب نظر آتی ہے بلکہ پاکستان سے باہر بھی کئی مشاعروں میں بلوچستان کی نمائندگی کا اعزاز رکھتی ہے۔ میں ذاتی طور پر ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا معترف ہوں اور ان کی شخصیت کا ایک خوشگوار تاثر میرے ذہن میں ہمہ وقت رہتا ہے۔ وہ ایک شائستہ، شگفتہ، شیریں گفتار اور خوش شکل شاعرہ ہے۔ وہ غزل کے ساتھ ساتھ نظم میں بھی مہارت رکھتی ہے جنہیں ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ وہ کوئٹے کی شاعرہ ہیں لیکن کوئٹے کی نہیں۔ کوئٹہ ان کی پہچان ہے اور چونکہ میں بھی کوئٹہ سے اپنی دیرینہ وابستگی کو اہمیت دیتا ہوں لہٰذا مجھے خوشی ہے کہ جہاں آرا تبسم بلوچستان سے تعلق رکھتے ہوئے پاکستان بھر کی ادبی فضا میں اپنے اسلوبِ سخن سے محبت عام کر رہی ہے۔ ان کے اکثر شعروں میں محبت کا تذکرہ بڑی خوبصورتی سے ملتا ہے۔ اس طرح کئی اشعار جہاں آرا تبسم کی شخصیت میں رچی بسی محبت کے آئینہ دار ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی شاعری کا محور محبت ہے تو کچھ غلط نہیں۔ وہ اپنی شاعری کو وسیلہ بناتے ہوئے پیغامِ محبت لوگوں کے دلوں تک پہنچانے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ درحقیقت جہاں آرا تبسم محبت کی شاعرہ ہے۔ میں ان کے تازہ شعری مجموعے ''محبت شاعری ہے'' پر انھیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ وہ ادبی اُفق پر ایک تابندہ ستارہ بن کر ہمیشہ جگمگاتی رہے۔

نام کتاب: شہریار غزل/ مرتب: ارشد محمود ارشد/صفحات 254 / قیمت: 200 روپے/فلیپ: ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

ناشر: نستعلیق پبلی کیشنز، فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

شمیل یوسف جدید اُردو غزل کے معروف اور معتبر شاعر ہیں۔ انھوں نے غزل کی روایت کا پورا احترام کرتے ہوئے اُسے نئے زمانوں کی بوباس اور رنگ

وآہنگ سے ہم کنار کیا۔ ان کی غزل اپنے منفرد جمالیاتی زاویوں کے باعث دامن کش دل ہے۔ یہ جمالیاتی زاویے ان کی فکر ہی سے بغل گیر نہیں بلکہ ان کے موضوعات، ان کی لفظیات اور ان کی تکنیک میں بھی لودیتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بعض معاصر جدت پسند غزل گوؤں کی طرح غزل میں مضحکہ خیز اور سطحی موضوعاتی، اسالیبی، تکنیکی اور ہیئتی تجربے نہیں کیے بلکہ غزل کی صدیوں پر محیط روایت کا احترام کرتے ہوئے اسے نئے رنگوں کی بشارت دی۔ فارسی شاعری کے بسیط مطالعے کا رنگ اُن کی غزل کی بافت اور بنت میں اپنا ہنر دکھاتا نظر آتا ہے۔ ان کی تشبیہات، استعارات، تراکیب، اور مصرعوں کے دروبست میں بھی اس فیضان کی جھلک ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ جمالِ یار کی کیف آفرینی اور ہجر و وصال کے خوش رنگ منظروں نے ان کی غزل کو ایک خاص نوع کی سرشاری سے ہم کنار کر دیا ہے جو ان کے معاصر شاعروں کے ہاں کم کم نمو کرتی ہے۔

جمیل یوسف کی شاعری پر اگرچہ معروف تنقید نگاروں اور معاصر اہلِ علم و ادب نے مضامین لکھے اور ان کے کلام کی تحسین اور تفہیم کے دریچے وا کیے تاہم مجموعی طور پر ان کی غزل گوئی کے فکری اور فنی پہلوؤں پر جامعیت کے ساتھ کوئی کام نہیں ہو سکا۔ اس کمی اور غفلت کیشی کو ان کے علاقے سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان ادیب اور شاعر ارشد محمود ارشد نے محسوس کیا اور ان کی غزل گوئی کے فکری اور فنی مطالعے کو اپنے ایم فل کے مقالے کی صورت میں پیش کر کے اس تاخیر کی تلافی کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ارشد محمود نے یہ مقالہ ۲۰۱۰ء میں علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد کے شعبہ اردو میں ایم فل کی ڈگری کے لیے پیش کیا۔ پانچ ابواب پر مشتمل یہ مقالہ جمیل یوسف کے سوانحی کوائف، ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل، ان کے معاصر شعری منظر نامے، ان کی غزل کے فکری اور فنی جائزے کو محیط ہے۔ مقالہ نگار نے غزل کے منظر نامے پر جمیل یوسف کے مقام و مرتبے کی تعیین کی کامیاب کوشش بھی کی ہے۔ انھوں نے جذب و شوق، محنت و جستجو اور تنقیدی و تحقیقی بصیرت سے یہ کام انجام دیا ہے۔ ان کی تنقیدی آرا متوازن اور ان کا اسلوبِ بیاں دلکش ہے۔ مختلف پہلوؤں کا جامعیت کے ساتھ احاطہ کرنا اور عمدہ اشعار کا انتخاب ان کے ذوقِ صحیح کی نشان دہی کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ارشد محمود ارشد کا یہ مقالہ جمیل یوسف کی غزل کو سمجھنے میں معاون ہے اور اس حوالے سے آئندہ کام کرنے والوں کے لیے بلاشبہ مضبوط بنیاد کا کام دے گا۔ میں ارشد کی اس کامیابی پر انھیں ہدیۂ تہنیت پیش کرتا ہوں اور دست بہ دُعا ہوں کہ ان کا یہ ذوق و شوق قائم رہے اور وہ اس نوع کے مزید کام کر کے بازارِ ادب کی رونق بڑھاتے رہیں۔

نام کتاب: ردائے شب پر ستارہ جھلمل/ شاعر: احمد سجاد بابر/ صفحات 128 / قیمت: 300 روپے/ فلیپ: سہیل ثاقب

ناشر: اُردو سخن، اُردو بازار، لاہور

احمد سجاد بابر کا کلام اور افسانہ میری نظروں سے گزر چکا ہے اور میں ان کی تابِ تحریر کا دل سے قائل ہوں۔ ان کا یہ شعری مجموعہ جس میں حمد باری تعالیٰ پیش کی گئی ہیں، پڑھ کر خوشگوار مسرت کا سامنا ہے کہ انہوں نے بڑی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ اللہ رب العزت سے اپنی وفاداری کا اظہار کیا ہے۔ اس کی بے کراں نعمتوں کا شکریہ ادا کیا ہے اور بین السطور اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوئے معافی بھی مانگی ہے۔ ان کی اس کوشش کی جتنی بھی تعریف کی جائے، بہت کم ہے۔ ویسے بھی اُردو ادب میں حمدیہ مجموعے گنی چنی تعداد میں شعرا کے ہاں ملتے ہیں۔ ان میں یہ مجموعہ ایک بہترین اور قدآور اضافہ ثابت ہونے جارہا ہے۔

احمد سجاد بابر کے ہاں روایت سے جڑی ہوئی جدید قدریں بھی موجود ہیں، قواعد و ضوابط کا احترام بھی دیکھا جاتا ہے اور بات سے بات نکالنے کا حسن بھی۔ انہوں نے قرآنی آیات کے الفاظ کو من وعن استعمال کر کے اپنے کلام کو نیا حسن بخشا ہے جو قاری کو یقیناً بہت پسند آئے گا۔

نام کتاب: مونالیزا ایک تصویر/ شاعر: وحید قندیل/ صفحات 160 / قیمت: 300 روپے/ فلیپ: حسن عباسی

ناشر: نستعلیق مطبوعات، اُردو بازار لاہور

وحید قندیل کون ہے، کہاں سے آتا ہے اور کہاں جاتا ہے میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ میری اُس کے ساتھ گنتی کی تین ملاقاتیں ہیں لیکن ایک

بات میں مکمل یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج کے دور میں مخلص دوست اور عظیم انسان بہت کم ہیں اور وحید قندیل ایک مخلص دوست اور عظیم انسان ہے۔ وحید قندیل کو میں نے مضطرب لا اور بے قرار پایا ہے۔ اُس کے اندر ایک بے چین روح ہے جو اُسے کہیں ٹک کر نہیں بیٹھنے دیتے۔ جب کسی معصوم کو قتل کر دیا جاتا ہے تو اُس کی روح بے چین بھٹکتی رہتی ہے۔ وحید قندیل کے اندر ایک بہت معصوم مگر انتہائی باصلاحیت اداکار تھے جسے وقت اور حالات نے مار دیا اور اب اُس اداکار کی روح بھی سفرنامہ نگار کا لبادہ اوڑھ کر ہمارے سامنے آتی ہے اور کبھی شاعر کا لیکن ہمیں اس روح سے ڈر نہیں لگتا۔ کیونکہ یہ اُس ''اداکار'' کی روح ہے جس کا باطن بھی اُس کے ظاہر کی طرح خوبصورت ہے۔ وحید قندیل کی ذات اور زندگی مجھے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی لگتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جس ٹکڑے کو بھی اُٹھاتا ہوں اس میں مکمل وحید قندیل ملتا ہے۔ اُس کی خموشی میں سخن ہے اور اس کے سخن میں چاشنی ہے۔ اُس نے شاعری کے شوق کو اپنے اندر تیتر کی طرح پالا ہوا ہے جس کی آواز سن کر اس کے چہرے پہ نور پھیل جاتا ہے۔ اُس کی شاعری مجھے کسی پرندے کی آواز کی طرح بانٹ کرتی ہے اور یہ آواز قریب سے نہیں بلکہ مجھے بہت دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جس کے اندر بیک وقت ہجر، ہجرت، نارسائی اور ادھورے پن کا دُکھ اور کرب شامل ہوتا ہے۔ ''مونالیزا'' اسی ادھورے پن کو مکمل ہونے کی ایک کوشش ہے میں اس کوشش کو اپنی بھیگی آنکھوں سے سراہتا ہوں۔

نام کتاب: احترامِ آدمیت/مصنف: علامہ ابن ابی الدنیاؒ/صفحات 368/ قیمت: 550روپے

ناشر: بکس بکس، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

''مکارم الاخلاق'' حافظ الحدیث امام ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ تعالیٰ کی وہ پانچویں کتاب ہے جس کا اُردو ترجمہ ''احترامِ آدمیت'' بکس بکس کو شائع کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے ہم اصلاحِ معاشرہ اور تعمیرِ شخصیت سے متعلقہ امام ابن ابی الدنیا کی چار کتابوں کے اُردو تراجم اپنے قارئین کے لیے شائع کر چکے ہیں جو بہت پسند کیے گئے۔ تیسری صدی ہجری جس میں یہ کتابیں مرتب کی گئی ہیں، اسلامی تاریخ میں افکار و علوم کی تدوین و تراجم کی صدی کہلاتی ہے۔ جب مسلمان ایک نئی عالمگیر و ہمہ گیر روح کے ساتھ تحقیق کے کام میں منہمک تھے، نئے طریقوں کے ساتھ علوم و افکار اور موجوداتِ عالم کی چھان پھٹک ہو رہی تھی اور پیمائش و مشاہدہ کے وہ جدید اسلوب زیرِ عمل آ چکے تھے جن سے یونان کے اہلِ علم بے خبر رہے تھے۔ اگر آپ ابن ابی الدنیا کی کتب و رسائل کی فہرست دیکھیں تو فوراً آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان کی شخصیت خدا پرستی، علم پسندی اور عوام دوستی کا بڑا خوب صورت مرقع تھی۔ آپ نے تاریخِ اسلام کی اوائل ادوار میں قرآنی مضامین و مفاہیم اور حدیث کی تدوین و ترویج ایسے حکیمانہ اسلوب سے کی کہ ان کا کام رہتی دنیا تک انسانیت کے لیے راہنمائی کا کام دیتا رہے گا۔ اس کتاب میں فلسفیوں کے انداز سے دقیقہ سنجی نہیں کی گئی بلکہ نبوی منہج کے مطابق ہمدردیٔ عوام کی سہل و عام فہم باتیں ہیں مگر دائرۂ گفتگو بڑا وسیع ہے۔ اس میں ان انسانی قدروں کی بات کی گئی ہے جن کی آج کے سائنسی و جمہوری سماج میں انسانیت کو پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ آپ اس کتاب کو ہنگامہ خیز روابط کے اس دور میں تعلقاتِ عامہ کے شعبہ کے لیے انتہائی آسان اور مفید راہنمائی کہہ سکتے ہیں۔

نام کتاب: ظہور نظر فن اور شخصیت/مصنف: ڈاکٹر خالق تنویر/صفحات 472/ قیمت: 750روپے/فلیپ: جمیل یوسف

ناشر: بکس بکس، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور

مجھے ظہور نظر پر رشک آتا ہے کہ ان کو پروفیسر خالق تنویر جیسا تذکرہ نگار ملا ہے۔ غالب بھی اس لحاظ سے بڑے خوش قسمت تھے کہ ان کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد جلد ہی مولانا الطاف حسین حالی جیسے بڑے ادیب اور شاعر نے ان پر ''یادگارِ غالب'' جیسی کتاب لکھ ڈالی۔ غالب کو زندہ جاوید کرنے میں یادگارِ غالب نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر خالق تنویر نے اپنی کتاب ''ظہور نظر...... فن اور شخصیت'' میں ظہور نظر کا تذکرہ اس محبت اور خوبی سے کیا ہے کہ وہ اپنی

تمام خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ اس کتاب کے اوراق میں زندہ اور متحرک نظر آتے ہیں، مجھے یہ کہنے میں ہرگز کوئی باک نہیں ہے کہ وہ دنیائے ادب کے ناقابلِ فراموش کرداروں میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہ ظہور نظر کی اپنی شخصیت کا طلسم اور سحر کاری ہے جو قاری کو اپنا اسیر بنا لیتی ہے۔ خالق تنویر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ممدوح کی شخصیت بڑے سلیقے، قرینے اور بڑی کامیابی سے اپنی تحریر کے آئینے میں منعکس کی ہے۔ ظہور نظر کی سحر کار اور کرشماتی شخصیت نے پہلی ملاقات میں ہی جو اثر ریاض الرحمٰن پر مرتب کیا تھا وہی اثر اس کتاب کے قاری پر ہوتا ہے۔ ریاض الرحمٰن صاحب فوراً گاڑی لے کر جناب محمد خالد اختر صاحب کے پاس جاتے ہیں اور اُنھیں کہتے ہیں "جلدی کرو بہاول پور چلنا ہے۔ وہاں ایک زبردست قسم کی شخصیت کا ظہور ہوا ہے۔ وہ آدمی ایک فی نامے نا ہے۔"

پروفیسر خالق تنویر نے اپنے مقالے کی تیاری میں بڑی تحقیق کی ہے، بڑی تلاش اور جدوجہد سے کام لیا ہے۔ جابہ جا اپنی تلاش اور تحقیق کے ثمرات سے کتاب کے اوراق کو مزین کیا ہے اور ہر حوالے اور اقتباس پر تنقید و تبصرہ کیا ہے مگر حیرت ہے کہ تحریر کا تسلسل، سلاست اور روانی کہیں مجروح نہیں ہوتے، کہیں سپیڈ بریکر نہیں آتا، قاری بیان کے بہاؤ میں بہتا چلا جاتا ہے۔ ظہور نظر بلاشبہ ایک کرشماتی اور سحر کار شخصیت اور ایک ناقابلِ فراموش شاعر تھا۔ اس نے غزلیں بھی کہی ہیں مگر اس کا تخلیقی جوہر نظموں میں لکھتا ہے۔ میں اس مختصر تحریر کو ظہور نظر کی نظموں سے چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دیے بغیر ختم نہیں کر سکتا۔

نام کتاب: آواز اُترتی ہے / شاعر: افضال نوید / صفحات 248 / قیمت: 500 روپے / فلیپ: حفیظ طاہر

ناشر: بک ہوم، مزنگ روڈ، لاہور

افضال نوید کا یہ شعر اُس کے نئے مجموعہ کلام کی کلید ہے اور 'آواز اُتر آتی ہے' کی تہہ میں اُترنے کے لیے اس شعر کو رہنما کرنا چاہیے۔ افضال نوید واقعتاً ایک بگولے کی طرح شہرِ غزل میں وارد ہے جہاں کی ہر جہت اُس کی دسترس میں ہے۔ اُس کی روح کے اندر ہے۔ یہ شعر اُس کے سابق مجموعہ 'افلاک لیے پھرتا ہوں' کو نئے مجموعہ کے ساتھ اس طرح جوڑتا ہے کہ دونوں ایک نامیاتی وحدت میں ڈھل جاتے ہیں۔

افضال نوید ایک مستقل اور مسلسل سفر میں ہے اور ایک سیدھی راہ پر گامزن ہونے کی بجائے ندرتِ ایجاد کے نئے موڑ مڑتا ہی جاتا ہے اور اُسے یقین ہے کہ یہ نت نئے موڑ شعر سازی کے ہنر میں نئی جہات روشن کریں گے۔ شاعری کے لیے کے لیے کار اندریں کی ترکیب افضال نوید ہی تراش سکتا ہے۔ ارفع شاعری میں یہ کار اندریں ہی ہے جو بیرونِ دل منتقل ہو کر اقبال کی شاعری کی طرح انقلاب برپا کر دیتا ہے اور فیض کی رومانوی انقلابی شاعری کو اثر پذیری عطا کرتا ہے۔ ندرتِ بیان افضال نوید کا خاصہ کلام ہے۔ وہ پہلے سے مستعمل خیالوں کو بھی نیا پیکر دے کر میرے جیسے سنجیدہ قاری کو بھی حیران کر دیتا ہے۔ دراصل یہ حیران کر دینے کی صلاحیت ہی شعر و ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ میں بڑائی کی دلیل ہے۔ اسد اللہ خان غالب کے زیرِ اثر کون نہیں ہے۔ اُس ایک بے مثل شاعر کے رنگ میں ایک شعر کہنا بھی محال ہے۔ مگر افضال نوید جیسا دلیر شاید ہی کوئی ہو جو غالب کے رنگ میں رہ کر اپنی چمک بھی دکھا سکے۔ افضال نوید کے محبت کرنے کے اپنے رنگ ہیں اور عشق کا اظہار کرنے کے اپنے ڈھنگ۔ وہ کوئی عام عاشق نہیں کہ سامنے جا کر کہہ دے "مجھے تم سے محبت ہے" وہ کوئی آؤٹ آف باکس طریقہ ایجاد کرتا ہے اور اسے بے جھجک عمل میں لے آتا ہے۔ راز دان شاعروں میں مشکل پسندی کا رجحان لامحالہ در آتا ہے۔ مرزا غالب بھی ایک عرصے تک اس رجحان کے زیرِ اثر رہے گا مگر پھر اسے ایک بھاری پتھر جانا اور چوم کر چھوڑ دیا۔ اب یہ افضال نوید ہی جانتا ہے کہ وہ اس انداز کو بے دل کی طرح جاری رکھتا ہے یا اسد اللہ خان غالب کی طرح ترک کر دیتا ہے۔

نام کتاب: جب نہر کنارے شام ڈھلی / شاعرہ: نیلما ناہید درانی / صفحات 128 / قیمت: 250 روپے / فلیپ: اشفاق احمد

ناشر: کلاسیک، 42 دی مال، لاہور

نیلما کی شاعری پڑھ کر مجھ پر ایک اور حقیقت واضح ہوئی کہ ہمارے یہاں عورت نام کی کوئی الگ جنس موجود نہیں۔ یہاں یا ماں ہے یا بہن ہے یا دلہن ہے یا

محبوبہ ہے یا بے شمار رشتے اور نشانیاں ہیں جن میں عورت آباد ہے لیکن خالی عورت اور صرف عورت ہمارے یہاں کہیں نہیں ملتی۔ جس طرح ولایت میں اور مغرب کے بھرے بڑے شہروں میں آپ کو ہزاروں، لاکھوں عورتیں سڑکوں پر، ساحلوں پر، ٹیوب سٹیشنوں میں اور فلک بوس فلیٹوں میں مل جاتی ہیں، بغیر کسی حوالے یا رشتے کے، بغیر کسی تعلق یا وابستگی کے، ویسی عورت ہمارے معاشرے میں موجود نہیں۔ آپ اس کتاب کا ایک ایک ورق اُلٹتے جایئے، ایک ایک شعر بلکہ ایک ایک مصرع دیکھتے جائیں۔ حنا کے لیے لکھی ہوئی ہر نظم ماں کا بین ہے۔ کھانستے ہوئے باپ کی نظم ایک مجبور بیٹی کی داستانِ غم ہے جو بڑھاپے کی منزل سے نکل کر موت کی وادی میں اُترتے ہوئے باپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ ''ساجن اور سسرال'' ایک بہو کا نوحہ ہے جسے خاوند کی بے پناہ محبت کے درمیان زہریلے کانٹوں نے ڈس لیا ہے۔ باقی ساری نظمیں محبوبہ کی ہیں، بیوی کی ہیں، جن میں گلے شکوے بھی ہیں۔ رنج اور راحتوں کے ذکر بھی ہیں۔ محبتوں کی ذہنی رسائیاں اور بدنی قربتیں بھی ہیں۔ پھر زندگی کے تضادات اچھی طرح سے سمجھ میں آ جانے کے بعد اپنے آپ کے لیے یاد دہانیاں بھی ہیں۔ اس لڑکی کی نظمیں پڑھ کر، سن کر اور دیکھ کر خوشی بھی ہوتی ہے اور خوف بھی آتا ہے کہ آخر اس کے ارادے کیا ہیں! ہر شعر میں ایک تجربہ اور ہر ہر سطح میں ایک انوکھا تخن ہے۔ اتنی چھوٹی عمر میں تخن کے دارو کا ایسا اہتمام کرنا اور اسے اس آسانی سے عام کر دینا میری دانست* کے احاطے میں تو کہیں نظر نہیں آتا۔ یہاں سے دور کسی نے ایسا کیا ہو تو معلوم نہیں۔ نیلما کی شاعری تربوں کی کپکپاہٹ ہے۔ جس طرح ستارے سے زخمہ اُلجھ کر نیچے کے خاموش تاروں کو مرتعش کر دیتا ہے اسی طرح واردات کا پنجہ دل و دماغ کو دھنک کر روح کی ساری تربوں میں لرزہ پیدا کر دیتا ہے۔ یہی لرزہ، یہی انجانے کا خوف اور پھر اس مقام پر...... سکون کی تمنا نیلما کی شاعری کا امتیازی نشان ہے۔

نام کتاب: پاکستان میں اُردو تنقید/مصنف: ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی/صفحات: 288/قیمت: 440 روپے/فلیپ: ڈاکٹر شافع قدوائی

ناشر: بیکن بکس، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور

برصغیر کے ادبی حلقوں میں یہ مفروضہ مسلمہ صداقت کی صورت اختیار کر گیا ہے کہ تنقید ایک منضبط اختصاصی شعبہ علم کے طور پر ہندوستان میں زیادہ برگ و بار لائی اور پاکستان میں تخلیقی ادب کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ پاکستان کے معروف قلم کاروں ناصر کاظمی، فیض، انتظار حسین، اشفاق احمد، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، فراز، پروین شاکر اور کشور ناہید کی تخلیقی ثروت مندی کا اعتراف عام طور پر کیا جاتا ہے۔ مگر محمد حسن عسکری، وزیر آغا، مظفر علی سید، محمد علی صدیقی اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی استثنائی مثالوں سے قطع نظر، پاکستان میں تنقیدی اور نظریاتی مباحث اور ان کے اطلاقی امکانات کو بروئے کار لانے کی کوششوں کو سراغ کم ہی ملتا ہے۔

ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی نے اپنی مبسوط کتاب ''پاکستان میں اُردو تنقید'' میں گہری معروضیت اور دقت نظری کے ساتھ اس عام غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے اور پاکستان میں تنقید کے عہد بہ عہد ارتقا کا نہ صرف تفصیلی ذکر کیا ہے بلکہ اس کے مختلف دبستانوں اور رجحانات سے وابستہ نقادوں کے فنی امتیازات پر بھی دلجمعی کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ مصنف نے ترقی پسند تنقید کے ضمن میں ہندوستان اور پاکستان کے معروف نقادوں کا ذکر کیا ہے اور اُردو کو ترقی پسند تنقید کی عطا (Contribution) کا اعتراف کرنے کے باوجود بالکل درست لکھا ہے کہ مارکسی تنقید جس عملی سائنسی طریق کار کا تقاضہ کرتی ہے وہ اُردو کے ترقی پسند ناقدین کے ہاں کم کم ہی نظر آتا ہے۔ حلقہ ارباب ذوق نے نظم کو مرتکز آمیز مطالعہ کا ہدف بنانے کی طرح ڈالی تھی اور اس کا نقطۂ آغاز میراجی کے تجزیاتی مطالعے تھے جو بعد میں ''اس نظم میں'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی نے لکھا ہے کہ پاکستان میں ترقی پسند تحریک، پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کی تحریکوں کے زوال پذیر ہونے کے باوجود حلقہ ارباب ذوق کی تنقیدی فکر مسلسل جاری ہے مگر یہ امر تعجب خیز ہے کہ حلقہ نصف صدی سے زیادہ مدت سے سرگرم مگر اب تک کوئی نظریہ ساز نقاد سامنے نہیں آیا۔ مصنف کے مطابق اس کا اصل سبب یہ ہے کہ حلقہ نے مجلسی تنقید کو فروغ دیا جس نے ذہن سازی کا فریضہ انجام تو دیا مگر اس نوع کی تنقید محض گفتگو کی برجستگی (Immediacy) سے اپنی غذا حاصل کرتی رہی۔ لہٰذا کوئی اہم تنقیدی کارنامہ منصۂ شہود پر نہیں آیا۔

پاکستان میں ساختیات، پس ساختیات اور نو آبادیاتی ڈسکورس کس طرح قائم ہو رہا ہے اور نئے تنقیدی محاورہ کے امتیازی عناصر کیا ہیں، یہ کتاب ان امور کو بھی موضوع بحث بناتی ہے۔ یہ کتاب مقدمات کی تدوین اور نتائج کے استخراج کی سطح پر تنقیدی بالغ نظری کا ثبوت فراہم کرتی ہے اور ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی کو ایک باشعور نقاد کے طور پر بھی Establish کرتی ہے جو اردو تنقید کے لیے فال نیک ہے کہ پاکستان، بلکہ ہندوستان میں بھی گہرے تنقیدی شعور سے

متصف نقادوں کا عام طور پر فقدان نظر آتا ہے اور مجلسی تنقید کے محور پر گردش کرنے والے نقادوں کو فوج ظفر موج سیمناروں میں نئے معرکے اور فتوحات طے کرتی نظر آتی ہے۔

نام کتاب: جاگے ہیں خواب میں/ ناول نگار: اختر رضا سلیمی/ رائے: اقبال طارق

اختر رضا سلیمی بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کے دو مجموعے "اختراع" اور "ارتفاع" جب کہ نظموں کا ایک مجموعہ "خواب دان" کے نام سے شائع ہو کر شائقین ادب سے داد وصول کر چکا ہے۔ اب ان کا ناول "جاگے ہیں خواب میں" کے نام منظر عام پر آیا ہے جسے ادبی و عوامی دونوں حلقوں میں بے حد سراہا جا رہا ہے۔ اس ناول کا موضوع انتہائی پیچیدہ ہے اور اُردو میں اپنے موضوع کے اعتبار سے شاید نیا بھی لیکن ناول نگار نے کمال مہارت سے اس کا تانا بانا بنا ہے۔ ناول ہزارہ میں بہنے والے دریائے ہرو کے جنوبی کنارے پر آباد ایک خاندان کی سماجی اور جینیاتی یادوں کا سلسلہ ہے۔ ناول کی کہانی مرکزی کردار زمان کے گرد گھومتی ہے۔ جو 2005 کے زلزلے کے دوران زخمی ہو کر کومے میں چلا جاتا ہے۔ کومے کے دوران وہ ایک طویل خواب دیکھتا ہے، جس میں وہ پشت در پشت اپنے آباؤ اجداد کی طرف سفر کرتا ہے۔ جب اسلام آباد کے ایک ہسپتال میں اسے ہوش میں لایا جا رہا ہوتا ہے وہ تقریباً اسی بیاسی پشت پہلے مہاراجہ اشوک کے عہد میں ہوتا ہے۔ جہاں وہ چٹانوں پر اشوک کے فرمان کندہ کر رہا ہوتا ہے۔ ہوش میں آتے ہی وہ اپنا ماضی کھو بیٹھتا ہے اور وہی خواب اس کا ماضی بن جاتا ہے۔ یوں کہانی ایک اور موڑ لیتی ہے۔ ناول کا اس سے بھی زیادہ دلچسپ موڑ وہ ہے جہاں وہ ہوش میں آنے کے باوجود خروشتی رسم الخط، جو اب معدوم ہو چکا ہے، میں چٹان پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ لیتا ہے۔ ناول میں تاریخ، طبیعیات، مابعد الطبیعیات، زمان و مکاں، مذہب، اساطیر، نفسیات، جینیات، فلکیات، علم نجوم اور فکر و فلسفہ یوں گندھے ہوئے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنا ناممکن سا لگتا ہے۔ اتنے سارے علوم کی یکجائی کے باوجود کہیں بھی بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا۔ تمام چیزیں کہانی کی ضرورت کے مطابق آگے بڑھتی ہیں۔ ناول کا ماحول بھی بالکل نیا ہے۔ جو قاری کو ایک نئے جہان سے روشناس کراتا ہے۔ یہ ناول نہ صرف اپنے موضوع کے حوالے سے قابل توجہ ہے بل کہ تکنیک، کردار نگاری اور زبان کے حوالے سے بھی جاذب نظر ہے۔

ایک ایسے دور میں جب اردو ناولوں کی کہانیاں چند مخصوص موضوعات کے گرد گھوم رہی ہیں، اختر رضا سلیمی کا یہ ناول اور بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔

کراچی سے تعلق رکھنے والے ممتاز مصور وصی حیدر نے اس ناول کے سرورق کے طور پر ایک ہزار ایک پینٹنگ بنائی ہیں۔ یوں اس ناول کے ابتدائی ایک ہزار ایک نسخوں کا سرورق نہ صرف ایک دوسرے سے مختلف ہے بلکہ اوریجنل پینٹنگز پر بھی مشتمل ہے۔ یہ پینٹنگز جہاں وصی کی سلیمی سے محبت کی آئندہ دار ہیں وہیں ادب اور مصوری کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی ایک کوشش کے ساتھ ساتھ شاید اپنی نوعیت کا ورلڈ ریکارڈ بھی ہے۔

نام کتاب: میری فکر میرا جہاں/ شاعر: شاہد ایم بیگ/ صفحات: 128 / قیمت: 250 / رائے: ناز اوکاڑوی

ناشر: نستعلیق پبلی کیشنز، اُردو بازار لاہور

میری فکر میرا جہاں شاہد ایم بیگ کا اولین شعری مجموعہ ہے۔ شاہد بیگ اُردو شاعری کی طرف کس طرح مائل ہوئے یہ آپ کو خود ہی بتائیں گے۔ مجموعہ کا ٹائٹل بھی بہت سی وضاحتیں پیش کرتا ہے کہ فکر اور جہاں ساتھ ساتھ ہیں۔ شاہد بیگ نے اپنی فکر کے جہاں جدید انداز اور منفرد لہجے میں قارئین کو پیش کر کے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ اس شعری مجموعہ میں وہ سب کچھ ہے جو ایک مجموعہ میں ہوتا ہے۔ یعنی مکمل غزلوں کا مجموعہ ہے ہر غزل ایک الگ رنگ لیے ہوئے ہے۔

نامہ ہائے احباب

محترمی حسن عباسی صاحب! سلام مسنون

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ ''ارژنگ'' مجھے باقاعدگی سے عنایت فرما رہے ہیں۔ اس خوبصورت پرچے نے میرے بڑھاپے کا رابطہ نوجوان نسل کے ساتھ قائم کر رکھا ہے۔

مئی کے شمارے میں آپ نے ظفر اقبال صاحب کو معذرت کے ساتھ یاد فرمایا۔ حالاں کہ ان کے ''دال دلیا'' پر آپ کو بلا معذرت اظہارِ خیال کرنا چاہیے تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ظفر اقبال نے مہمان شعرا خوشبیر سنگھ شاد اور رنجیت سنگھ چوہان کے اس دکھ کو بالکل محسوس نہیں کیا ہوگا جو انہوں نے ''دال دلیا'' میں ان کو معمولی درجے کا شاعر قرار دے کر دانستہ انجام دیا۔ ظفر اقبال صاحب نے اُردو غزل میں اپنی ''شہرت'' کا معیار خود قائم کر رکھا ہے اور گواہ کے طور پر انہیں آفتاب اقبال دستیاب ہے۔ جو اتفاق سے ان کا صاحبزادہ ہے اور ٹی وی کا ایک مزاحیہ پروگرام کرتا ہے۔ سنجیدہ نقادوں میں سے بھارت کے شمس الرحمان فاروقی نے انہیں ازرہِ مذاق غالبؔ سے بڑا شاعر قرار دے دیا تھا۔ ظفر اقبال نے یہ چھتری مستقل طور پر سر پر اوڑھ رکھی ہے۔ حالاں کہ شمس الرحمان فاروقی نے اپنا بیان واپس لے لیا ہے۔

پچھلے دنوں واقعہ یہ ہوا کہ جناب سعید پرویز نے بھائی حبیب جالب کی مزاحمتی شاعری اور غزل کی تعریف روزنامہ ایکسپریس میں کر دی۔ ظفر اقبال اس سے قبل حبیب جالب کو رسالہ ''زیست'' کراچی میں رگید چکے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں حبیب جالب کی خدمات کا تجزیہ پیش کروں گا اور یہ کہنا بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ ظفر اقبال نوجوان نسل کو گمراہ کر رہے ہیں۔ یہ بات انہیں بری لگی اور انہوں نے اس ناچیز کو جس نے شاعر ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا بعض غلط الزامات لگا کر ''رگید'' ڈالا۔ ظفر اقبال چند پرانی باتوں کو لے کر بیٹھے جن کی تردید میں بارہا کر چکا ہوں۔ ان کا ارشاد تھا کہ ایک زمانے میں انہوں نے (یعنی انور سدید نے) کسی کی نظم اپنے نام سے چھپوا دی تھی۔ میں نے (یعنی ظفر اقبال نے) اس کا نوٹس لیا تو کوئی جواب آیا نہ وضاحت۔

اب مجھے اندازہ نہیں ہے کہ ظفر اقبال کا اشارہ کس نظم کی طرف ہے۔ ہاں ایک ''لمرک'' کا قضیہ ضرور ہوا تھا جو مجھے ڈاکٹر وزیر آغا نے سنائی اور اس کا اطلاق اس دور کی افغانستان جنگ پر کیا۔ میں نے یہ واقعہ ''پاکستان ٹائمز'' کے خطوط کے کالم میں لکھا تھا اور ''لمرک'' کا اقتباس بھی دیا تھا۔ میرے کسی بدخواہ نے جو پاکستان ٹائمز کے دفتر میں کام کرتے تھے میرے صرف ایک لفظ تبدیل کر کے نظم میرے نام لگا دی۔ میں نے اس کی تردید اگلے دن ہی کر دی اور یہ بھی خطوط کے کالم میں چھپ گئی۔ ظفر اقبال نے اس تردید کا ذکر تک نہیں کیا اور یہ ان کی بددیانتی ہے۔ ان کا یہ الزام بھی غلط ہے کہ میں نے رسالہ ''سرسبز'' سے ظفر اقبال کا ایک خط رسالہ ''چہارسو'' میں اپنے نام سے من و عن چھپوا لیا تھا۔ ظفر اقبال نے ثبوت پیش نہیں کیا بلکہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ ہاں یہ واقعہ ضرور ہوا کہ کسی نے شہزاد احمد کے خلاف ایک خط میرے نام سے ''چہارسو'' میں چھپوا دیا۔ میں نے اس کی فوراً تردید کر دی تھی اور شہزاد احمد کو بھی یقین تھا کہ اس قسم کا کام ظفر اقبال جیسا کوئی آدمی ہی کر سکتا ہے۔ ظفر اقبال صاحب کو شکوہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا پر وارث علوی کی دشنامی تنقید کا جواب انور سدید نے نہیں دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وارث علوی کی تنقید بالعموم غیر سنجیدہ اور دشنام آلود ہوتی ہے۔ اس کا جواب تو ہندوستان میں بھی کبھی کسی نے نہیں دیا۔ پاکستان کے نقاد اس سے کیوں اُلجھتے۔ آخری عمر میں وارث علوی کو شکایت یہ تھی کہ ان کے لکھے کا نوٹس پاک و ہند میں کوئی ادیب نہیں لیتا۔ ظفر اقبال پریشان نہ ہوں وارث علوی کی تنقید سے ڈاکٹر وزیر آغا کے مقام اور مرتبے پر ذرا سی آنچ بھی نہیں آئی۔

آخر میں مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ اردو ادب میں حبیب جالب کی مزاحمتی اور غزلیہ شاعری کا اپنا ایک مقام امتیاز ہے۔ ان کی شاعری پر کتابیں

چھپ رہی ہیں، ان کی غزل کو ادب کی تاریخ نظر انداز نہیں کرسکتی۔ وہ ادب میں اپنے پورے قد کے ساتھ زندہ رہیں گے لیکن ظفر اقبال کا رطب و یابس زمانے کی گرد میں گم ہو جائے گا۔ ان کی اپنی وکالت بھی کام نہیں آئے گی۔

یہ چند باتیں میں نے وضاحت کے طور پر عرض کر دی ہیں۔ مقصود ظفر اقبال سے ترکِ تعلق ہرگز نہیں۔ جولائی کے پرچے میں آپ کی تازہ غزل کے مطلع نے حیرت زدہ کر دیا۔ اس مطلع کا مضمون غیب سے اُترا ہے اور اب نوائے سروش بن گیا ہے۔

درخت رستے میں کیا کھڑا تھا
کہ جیسے مردِ دُعا کھڑا تھا

''متفرق شاعری'' کا عنوان مناسب معلوم نہیں ہوا۔ ''متفرق'' نہ لکھا جائے تو عنوان زیادہ موزوں محسوس ہوگا۔

انور سدید

محترم ایڈیٹر صاحب! عامر بن علی

السلام علیکم۔ اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے اور اپنی ادبی سرگرمیاں ملک و ملت کا نام روشن کرنے میں مگن ہوں گے۔ دعا ہے اللہ آپ کو ہمت و توانائیاں عطا کرے کہ آپ ادب کی دنیا میں ایک نمایاں نام ''ارژنگ'' کی دن دگنی رات چگنی ترقی میں اپنا کردار ادا کرتے رہیں۔

ارژنگ کی قاریہ ہوں مگر شرکت پہلی بار کر رہی ہوں۔ ایک عدد غزل کے ہمراہ۔ میں یہاں ایک مقامی کالج میں وائس پرنسپل ہوں اور شاعری کرتی ہوں۔ مختلف ادبی رسائل، الحمرا اور دیگر میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ میری تخلیقات، مگر بزمِ ارژنگ میں میری پہلی حاضری ہے۔ اُمید ہے جگہ مل سکے گی۔

فرح دیبا

اسلام آباد

بھائی حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ ''ارژنگ'' باقاعدہ مل رہا ہے۔ اس محبت پہ آپ کا سپاس گزار ہوں۔ ''ارژنگ'' میں شامل نگارشات قابلِ توصیف ہوتی ہیں۔ آپ جس محبت سے مجھے شائع کرتے ہیں اس پہ بھی آپ کا ممنون ہوں۔ ''ارژنگ'' کے لیے تازہ قطعات بعنوان ''ولولہ'' ارسال کر رہا ہوں۔ قبول فرمایئے

والسلام

اسد اعوان

ساہیوال

جنابِ حسن عباسی صاحب! آداب

اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔ پچھلے مہینے سے اب تک ''ارژنگ'' موصول نہیں ہوا اُس کی کوئی خاص وجہ رہی ہو تو ضرور بتایئے۔ پچھلے دو ماہ کا ارژنگ بھی اگر ہو سکے تو ارسال کیجیے۔

آپ کے دورہ آسٹریلیا اور دیگر جگہوں کی تصاویر فیس بک پہ دیکھتی رہتی ہوں۔ جناب سلامتی سے وطن واپس آیئے اور آج کی مصروف دنیا میں اس تیز رفتار ترقی سے حظ اُٹھایئے۔

سلامت رہیں

آسناتھ کنول

لاہور

محترم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ ''ارژنگ'' کا نام تو سن رکھا تھا، آج ناز اوکاڑوی صاحب کو ملنے گیا تو ''ارژنگ'' سے بھی تعارف ہو گیا۔ ماشاء اللہ پرچہ اپنے مواد، کوالٹی سائز اور خوبصورت لے آؤٹ، سبھی عوامل نے متاثر کیا ہے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ''ارژنگ'' کے کچھ گزشتہ شمارے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ خصوصاً پنجاب رنگ کے صفحات شامل کر کے آپ نے پنجابی لکھنے والے حضرات کو بھی ''ارژنگ'' میں چھپنے کا موقعہ فراہم کر دیا ہے۔

''ارژنگ'' کے سبھی سلسلے، افسانہ، شاعری، انٹرویو اور غیر ملکی لٹریچر کے تراجم وغیرہ کی طرف بھی آپ خصوصی دھیان دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مضافات کے ادیبوں کو بھی آپ نہیں بھولتے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور مجلسِ ادارت کے تمام ارکان کو اسی جوش و جذبے، ولولے اور ہمت سے کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

والسلام

ڈاکٹر محمد ریاض شاہد

عزیزم عامر بن علی مدیرِ اعلیٰ صاحب!

ماہنامہ ارژنگ، لاہور

دعوات۔ اُمید ہے خوش ہوں گے۔ آپ کا مؤقر مجلّہ باقاعدگی سے راقم کو مل رہا ہے۔ آپ معیاری اُردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ دل چاہا کہ آپ کو شاباش دوں اور آپ کے رسالے کے لیے ایک ارمغاں بھی ارسال کروں۔ یہ تحفہ ایک نعت سید المرسلین ہے۔ اُمید ہے اسے اپنے جریدے کی زینت بنائیں گے۔

اُمید ہے راقم کی طرف سے ایسی قلمی معاونت جاری رہے گی۔ تمام کارکنانِ رسالہ کو دُعائیں۔ دُعا ہے آپ یہ ادبی خدمت انجام دیتے رہیں گے۔

شفقت حسین نقوی

میاں چنوں

برادرم ناز اوکاڑوی صاحب!

السلام علیکم۔ بروز اتوار تقریباً ساڑھے تین بجے آپ کے بھائی جاوید صاحب کے دردولت پر حاضر ہوا۔ اظہار افسوس کیا۔ آپ بازار گئے ہوئے تھے ملاقات نہ ہو سکی۔ آپ کی بھاوج صاحبہ کی وفات پر بہت افسوس ہوا۔ حکم الٰہی کے سامنے انسان بے بس ہے۔ اس کی رضا پر سر جھکا دینا ہی عبودیت کی معراج ہے۔ جانے والے کی کمی کبھی پوری نہیں ہوتی۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہے جو آہستہ آہستہ سب صدموں کو محو کر دیتا ہے۔ مری دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین...... بوسیلہ آقائے نامدار ﷺ مرحومہ کو اپنے رحمتوں کے سائے میں رکھے۔ آمین

ماہنامہ ارژنگ کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔

فقط والسلام

قمر حجازی

اوکاڑا

حسن عباسی صاحب اور عامر بن علی صاحب!

السلام علیکم۔ آج ہی محترم جناب ناز اوکاڑوی صاحب کی وساطت سے ارژنگ ملا۔ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ معیاری کاغذ پر نہایت نفیس پرنٹنگ کا حامل پرچہ نہ صرف اپنے گٹ اپ میں معیاری ہے بلکہ تحریروں کے اعتبار سے بھی کسی بین الاقوامی رسالے سے کم نہیں ہے۔ سب سے منفرد چیز مختلف شہروں کی الگ الگ نمائندگی ہے۔ ہاں البتہ محترم جناب ریاض حسین زیدی کی طرح میں بھی یہ تجویز دوں گا کہ ادبی موضوع پہ مدیرانہ مضمون ضرور شامل کرنا چاہیے۔ ماں بولی پنجابی کا سیکشن رکھ کر بڑا عمدہ کام کیا۔ اس نفسا نفسی کے دور میں ایسے عمدہ ادبی رسائل نکال کر آپ واقعی ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اللہ اجر عطا فرمائے۔

تنویر سیٹھی وہاڑی

محترم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں اپنی سٹوری ''توبہ کا در کھلا ہے'' لے کر حاضر ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ کے معیار پر پوری اُترے گی اور ارژنگ میں جگہ پائے گی۔

اللہ تعالیٰ آپ کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا کرے۔ آمین...... والسلام

آپ کی بہن

شازیہ محسن

خانیوال

لوگ پابندِ سلاسل ہیں مگر خاموش ہیں
بے حسی چھائی ہے ایسی گھر کے گھر خاموش ہیں

دیکھتے ہیں ایک دوجے کو تماشے کی طرح
ان پہ کرتی ہی نہیں آہیں اثر، خاموش ہیں

ہم حریفِ جاں کو اس سے بڑھ کے دے دیتے جواب
کوئی تو حکمت ہے اس میں ہم اگر خاموش ہیں

اپنے ہی گھر میں نہیں ملتی اماں تو کیا کریں
پھر رہے ہیں مدتوں سے دربدر خاموش ہیں

ٹوٹنے سے بچ بھی سکتے تھے یہاں سب آئنے
جانے کیوں اس شہر کے آئینہ گر خاموش ہیں

پیش خیمہ ہے شناور یہ کمی۔ طوفان کا
سب پرندے اڑ گئے ہیں اور شجر خاموش ہیں

عمران شناور

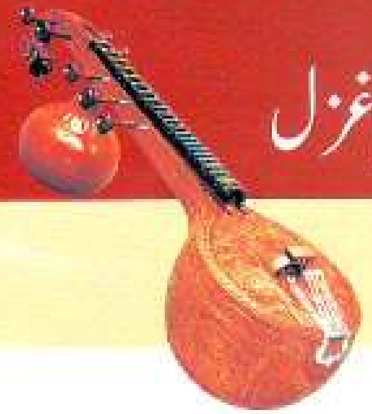

ماہی آرٹس اینڈ کلچر کے زیراہتمام آسٹریلیا (سڈنی) میں شامِ غزل

پاکستان سے نامور گلوکار غلام عباس اور ممتاز شاعر حسن عباسی کی شرکت

ادب اور آرٹ کی ترویج میں کوشاں ہیں

ظفر خان

مستقبل میں بھی ایسے پروگرام کراتے رہیں گے

ماہا ظفر خان

شامِ غزل میں پاکستانی کمیونٹی کی بھرپور شرکت، آسٹریلیا میں پاکستان کے کونسل جنرل عبدالعزیز اکیلی تھے

آسٹریلیا کے دارالخلافہ کینبرا میں
بزمِ ادب کے زیراہتمام
حسن عباسی کے اعزاز میں
شعری نشست

بنکاک کی سیر و سیاحت اور ممتاز شاعر
فیصل عجمی سے حسن عباسی کی ملاقات

مکمل رپورٹ اندر کے صفحات پر

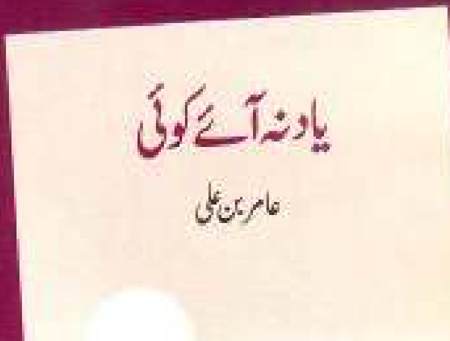

Read Arxang Online
www.amirbinali.com
www.millat.com

معروف شاعر، کالم نویس اور مترجم **عامر بن علی** کے پہلے شعری مجموعے

"یاد نہ آئے کوئی"

کا تازہ ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔

نامور شاعر شہرت بخاری (مرحوم)

"یاد نہ آئے کوئی" کے بارے میں کہتے ہیں۔

اردو شاعری کی ایک روایت یہ بھی رہی ہے کہ نو واردان اپنے شوق کا آغاز غزل سے کرتے ہیں۔ غزل برصغیر کے مزاج میں رچی بسی ہوئی ہے۔ اس لیے بھی کہ غزل کی بنیاد ہماری موسیقی پر ہے، مگر گاہے گاہے اور یہ گاہے گاہے بے حد کم ہے کہ کسی مبتدی نے غزل سے قطع نظر کر کے شعر کہا ہو اور نظم کو ہی روایتی پابندیوں سے کسی حد تک آزاد رکھا ہو۔

عامر بن علی ایک ہی نام ہے۔۔۔۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ نظم سے اپنی شعری زندگی کا آغاز کیا بلکہ اتنا کہا کہ مجموعہ بن گیا۔ اس کم عمری میں مجموعہ بنا لینا بھی آسان کام نہیں تھا۔ مگر "یاد نہ آئے کوئی" ان کے شوق کی فراوانی کی گواہی ہے۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ اگر کوئی طالب علمی کے زمانے ہی میں مجموعہ تیار کر سکتا ہے تو میری عمر تک پہنچتے پہنچتے کتنے مجموعے تیار کرے گا۔

یہ مجموعہ نئی نظموں کا نمونہ ہے۔ اس کی نظم جدید نظم کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے جو کہ ن۔م۔ راشد اور میراجی سے علیحدہ رجحان کا پتہ دے رہی ہے۔ بعض اوقات چونکا بھی دے رہی ہے۔

شہرت بخاری

۱۸ جولائی ۱۹۹۸

Design By: MUHAMMAD AHSUN Gull